Phone 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ستمبر 1966

۶ ستمبر ۱۹۶۵ء

شہدائے پاکستان
اس انتظار میں ہیں کہ ہم ان کے خون کی
قیمت کب ادا کرتے ہیں۔

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

اس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا

اسلام کیا ہے

پرویز

ہمارا یہ دعویٰ ہے (اور مبنی برایمان دعویٰ) کہ اسلام، نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا؟ تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں "اسلام" بحیثیت ایک نظامِ حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح اور دلکش انداز میں یکجا پیش کیا جائے —— یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔

کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر باب مصنف کے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن کا ماحصل پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب:

(۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنا دے۔ اور

(۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

کتاب قریب پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دو اقسام میں شائع کی گئی ہے۔

قسم اول۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ مضبوط جلد۔ حسین گرد پوش۔ قیمت فی جلد۔ آٹھ روپے۔

قسم دوم۔ مکینیکل پیپر۔ بکس بورڈ کور۔ قیمت فی جلد۔ چار روپے۔

فرمائش کے ساتھ اس کی تصریح کر دی جائے کہ کونسی قسم کی جلد مطلوب ہے۔

ملنے کا پتہ۔ ناظم طلوع اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک
پاکستان
سالانہ ــــــ دس روپے
ہندوستان
سالانہ ــــــ ۱۵ روپے
غیر ممالک سے
سالانہ ــــــ ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاکستان سے ★ ہندوستان سے
ایک روپیہ ڈیڑھ روپیہ

ٹیلیفون نمبر ۸۰۸۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

جلد ۱۹ ستمبر ۱۹۶۶ء نمبر ۹

فہرست مضامین

(۱) انتساب ــــــ (۲)
(۲) یاد میں ــــــ (۳)
(۳) لمعات ــــــ (۴)
(۴) ایک انقلاب آفریں رات ــــــ (محترم پرویز صاحب) ــــــ (۲۵)
(۵) تو اگر بھول گیا ہو تو بتا دوں تجھ کو ــــــ (۲۹)
(۶) دین کی باتیں ــــــ (محترمہ ثریا عندلیب) ــــــ (۳۰)
(۷) لغات القرآن کیا ہے ــــــ (۳۱)
(۸) ایک طاہرہ بیٹی کا خط ــــــ (بچوں کا صفحہ) ــــــ (۳۲)
(۹) سیارت کا عالمی کردار ــــــ (محترم خورشید عالم صاحب) ــــــ (۳۳)
(۱۰) اساسِ محکم ــــــ (۴۲)
(۱۱) اسلامک سوشلزم ــــــ (۵۵)
(۱۲) رابطۂ باہمی ــــــ (۶۳)
(۱۳) الزامات ــــــ (۶۵)
(۱۴) حقائق و عبر ــــــ (۶۷)
(۱۵) نقد و نظر ــــــ تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ــــــ موسیقی کی شرعی حیثیت ــــــ (۷۸-۸۰)

ایڈیٹر۔ صفدر سلیمی، ناشر۔ سراج الحق، مقام اشاعت ۲۵/بی۔ گلبرگ لاہور، پرنٹر۔ شیخ محمد اشرف نے مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ لا

انتساب

گذشتہ ستمبر کے زلزلہ انگیز دنوں کی بات ہے۔ میں دوپہر کے وقت اپنے کمرہ میں بیٹھا کام میں مصروف تھا کہ اطلاع ملی کہ ایک فوجی جوان ملنے کے لئے آیا ہے۔

چند لمحوں میں میرے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا۔ گرد و غبار سے اَٹی ہوئی وردی، کیچڑ میں لتھڑے ہوئے بوٹ۔ بکھرے ہوئے بال، ہونٹوں پر پپڑی جمی ہوئی۔ متوسط قامت، اکہرا بدن، زرد سے چہرے پر بچپن کے بھولے پن اور شباب کے ولولوں کا حسین امتزاج۔ لیکن آنکھوں میں بجلی کی سی چمک ۔۔۔ کہنے لگا کہ سیدھا محاذ سے آ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ عزیزم! یہ تو تمہاری صورت ہی سے عیاں ہے۔

کہا کہ اباجان طلوع اسلام پڑھتے ہیں۔ ہمارے گھر میں قرآن کریم کا چرچا رہتا ہے۔ دو تین دن ہوئے ان کا خط آیا تھا کہ اگر تھوڑی سی بھی فرصت مل جائے تو پرویز صاحب سے ضرور ملنا اور کہنا کہ وہ تمہارے لئے دعا کریں۔ مجھے آج ایک محاذ سے دوسرے محاذ کی طرف جانے کے سلسلے میں ادھر سے گذرنا تھا۔ گھنٹہ بھر کی فرصت تھی میں نے کہا کہ آپکی دعائیں لیتا جاؤں۔

میں نے اس سے جنگ کے حالات پوچھنے شروع کئے۔ اس نے تھوڑی دیر تک باتیں کیں اور پھر اجازت مانگی میں اٹھ کر اسکے سامنے کھڑا ہو گیا تو اس نے کہا کہ آپ نے مجھے دعا تو دی نہیں میں نے کہا کہ بیٹا! تمہیں کیا دعا دوں؟ اس نے کہا۔

میں دو محاذوں پر جا چکا ہوں اور دونوں سے زندہ واپس آگیا ہوں میں شوقِ شہادت سے تڑپ رہا ہوں۔ دعا کیجئے کہ اب کے محاذ میں مجھے شہادت نصیب ہو جائے۔

میں اس کے سامنے ساکت و صامت کھڑا تھا۔ مجھ میں ایک لفظ تک بولنے کی ہمت نہ تھی (میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے) میں نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اس کا ماتھا چوما۔ اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بمشکل اتنا کہہ سکا کہ

میرے عزیز! میری سو جانیں تم پر فدا ہوں، تم میری دعاؤں کے محتاج نہیں، میں تمہاری دعاؤں کا محتاج ہوں۔ یاد رہے تو محاذ پر میرے حق میں دعا کرنا۔

وہ پیچھے ہٹا، میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اسے گرمجوشی سے دبایا۔ فوجی سلام کیا اور آہستہ آہستہ لیکن نپے ہوئے قدم اٹھاتا واپس چلا گیا۔ اسکے قدموں کی آہٹ اس وقت تک میرے کانوں میں آ رہی ہے اور پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

"اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جسکے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد"

(پرویز) (طلوع اسلام۔ نومبر ۶۶ء)

معلوم نہیں جبینِ ملت کا یہ درخشندہ ستارہ اس دنیا میں ضو فشاں ہے یا جنت کی راہوں کو روشن کر رہا ہے۔ وہ جہاں بھی ہے زندہ اور پائندہ ہے۔ ہم طلوع اسلام کی اس اشاعت کو اُسی کی حرارتِ ایمانی کی طرف منسوب کر کے اس کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔
ذرۂ آفتاب سامانیم

یاد میں

(۱) پاکستان کی سرحدوں پر بسنے والے ان بے گناہ مظلوم انسانوں کی جنہیں بھارتی درندوں نے ۶ ستمبر ۶۵ء کی صبح بغیر کسی قسم کی آگہی یا اعلانِ جنگ کئے اُس وقت اپنی ہوس خون آشامی کا شکار بنایا جب وہ آرام سے اپنے گھروں میں سو رہے تھے، اور ستاروں کی آنکھوں کے علاوہ، اس خونی منظر کا دیکھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔

(۲) ان معصوم بچوں کی، جنہیں مرہٹہ "بلوانوں" اور سکھ "سورماؤں" نے اُچھال اُچھال کر اپنی سنگینوں کی نوکوں سے چھلنی کر دیا، اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے مسلمانوں کے گھروں میں جنم کیوں لیا تھا۔

(۳) اُن عصمت مآب دخترانِ ملت کی جنہیں یہ انسان نما بھیڑیئے، ان کے صحن خانہ سے اُن نامعلوم ویرانوں کی طرف کشاں کشاں لے گئے، جہاں سے پھر اُن کی آہ و فغاں تک کسی کو سنائی نہ دی۔

(۴) اور — یاد میں

اُن غیور و جسور جوانانِ امت کی جو اِن بے پناہ مظالم کا بدلہ لینے کے لئے شمشیر بکف اور کفن بدوش — میدانِ کارزار میں آنکلے اور اپنی عدیم النظیر جرأت و بسالت سے دنیا کو دکھا دیا کہ حق کی خاطر جان دینے والے کیا کچھ کر دکھایا کرتے ہیں۔

اور چھمب، جوڑیاں، سیالکوٹ، چونڈہ، واہگہ، برکی، ہڈیارہ، سلیمانکی، راجستھان کے میدانوں کے ان ذرات کی جو اپنی عالمتاب چمک دمک سے اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ خونِ شہداء کی رنگینی کس طرح حنا بندِ عروسِ ملت ہوتی ہے۔

لاکھوں سلام و صلوٰت ہوں اُن شہدائے اُمت اور مجاہدینِ ملت پر جنہوں نے اپنی فقید المثال قربانیوں سے اس خطۂ زمین کو دشمن کی دستبرد سے محفوظ رکھا جسے اسلام کی تجربہ گاہ بننے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔

سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

زندگی جہد است و استحقاق نیست

ہم نے پاکستان، میدانِ کارزار میں آزادی کی جنگ لڑکر حاصل نہیں کیا تھا۔ یہ ہمیں ایسے ہی مل گیا تھا جیسے کسی دیوانی مقدمہ میں، عدالت سے مدعی کو ڈگری مل جاتی ہے۔ اس مقدمہ میں ہماری کامیابی کا راز، ہمارے مطالبہ کی صداقت اور ہمارے وکیل کی بے مثال قابلیت، بلند پایہ دیانت اور انتھک سعی و کاوش میں مضمر تھا۔ قوم کا اِس میں اتنا ہی حصہ تھا کہ وہ مدعا علیہ اور اس کے حمایتیوں کی صبر آزما مخالفت، اور تخویف و ترہیب کے ہر ممکن حربہ کے باوجود، اپنے مطالبہ سے دستکش نہ ہوئی اور اپنے وکیل کی دیانت و امانت پر پورا پورا اعتماد رکھا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہم نے پاکستان اَنْمِٹ قربانیاں دے کر حاصل کیا۔ اور اس سے مراد ہوتی ہیں وہ خونریزیاں اور تباہ کاریاں جو تقسیم ملک کے بعد ہندوؤں کی طرف سے عمل میں لائی گئیں ۔۔۔ تو وہ حصولِ پاکستان کے لئے ہماری قربانیاں نہیں تھیں۔ وہ سب کچھ پاکستان حاصل ہو جانے کے بعد وقوع میں آیا تھا۔ ان کی مثال ایسی ہی ہے جیسے مقدمہ میں ہارا ہوا فریق، جیتنے والے فریق کو راستے میں گھیر کر فساد کیا کرتا ہے۔

لیکن اس قتل و غارت گری کے بعد بھی، ہندو کے سینہ میں مسلمان کے خلاف جذبۂ انتقام کی آگ بجھی نہیں، بلکہ اس کی حدت اور تیز ہو گئی۔ ہندو کی پوری تاریخ، ہوسِ خون آشامی کے ساتھ دنائیت اور کمینگی، اور جذبۂ انتقام کی تسکین کے ساتھ فریب کاری اور روباہ بازی کی مسلسل داستان ہے۔ یہ کچھ ہم ہی نہیں کہتے خود ہندوؤں میں بھی جب کبھی (حسنِ اتفاق سے) کوئی دیانتدار اہلِ فکر و نظر پیدا ہو جاتا ہے تو وہ

اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ حال ہی میں، دہلی میں رہنے والے ایک بنگالی اہل قلم (N.C. CHAUDHURI) کی کتاب (THE CONTINENT OF CIRCE) انگلستان سے شائع ہو کر دُنیا کے سامنے آئی ہے۔ اس میں، اس حقیقت پسند ہندو نے (جو ہندو ہونے کے باوجود اپنے آپ کو ہندو نہیں کہلانا چاہتا) نہایت محققانہ اور مؤرخانہ انداز سے، ہندو کی خونخواریت اور منافقت کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ اس کے بعد، اُس ملک (بھارت) کی طرف سے بساطِ سیاست پر جو کھیل کھیلا جا رہا ہے اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ بہرحال، یہ تذکرہ ضمناً آگیا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ پاکستان کو عدالت سے ڈگری تو مل گئی لیکن ہندو اپنی اس شکست کو برداشت نہیں کر سکا اور اس نے یہ تہیہ کر لیا ... کہ حق و انصاف پر مبنی اس عدالتی فیصلے کو دھاندلی سے بدل دیا جائے۔

اور اس کے بعد اس نے دھاندلی شروع کر دی۔

اور پاکستان کی جنگِ آزادی کا آغاز درحقیقت یہاں سے ہوا۔

ہندو کی یہی ذہنیت تھی جس کے پیشِ نظر ہم نے جولائی ۱۹۴۸ء میں کہا تھا کہ

> ہندو کے دماغی خلل کا علاج یہ ہے کہ اس کے دل سے یہ زعمِ باطل نکال دیا جائے کہ مسلمان کمزور ہے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسلمان اس کا عزم کر لے کہ جو آنکھ اس کی طرف بُری نیت سے دیکھیگی، وہ آنکھ نکال لی جائیگی، خواہ وہ کسی سر میں کیوں نہ ہو۔ اگر ہندوؤں نے کسی سمت سے بھی اپنے قدم بڑھائے تو مسلمانوں کی طرف سے اس کا جواب وہی ہونا چاہیئے جو ابدالی کی تلوار نے پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو دیا تھا۔ یاد رکھیئے! اگر ہندو کو ایک بار شکست مل گئی تو پھر وہ خود بھی امن سے رہیگا اور دنیا کا امن بھی بحال ہو جائے گا اور اس کے بعد ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان بھی عزت و آبرو کی زندگی بسر کریں گے۔

ہم نے اُس زمانے میں، محض قرائن و شواہد کی بنا پر یہ لکھا تھا۔ لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ سال گزشتہ، مسٹر مہاجن نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ ہندوستان نے ۱۹۶۵ء ہی میں پاکستان پر حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا[1]

---

[1] مسٹر این سی۔ چودھری نے کہا ہے کہ بھارت نے، ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۴ء کے درمیان، تین نہیں تو دو دفعہ پاکستان پر حملہ کرنے کا فیصلہ ضرور کر لیا تھا۔ (کتاب محولہ بالا صفحہ ۲۴۴)

اس نے اس کا فیصلہ تو اسی زمانہ میں کر لیا، لیکن اسے بروئے کار لانے میں اسے سترہ برس لگ گئے؛ تاآنکہ اس نے ستمبر ۶۵ء میں وہ کچھ کر دکھایا جس کی پہلی سالگرہ کی تقریب پر ہم یہ سطور قلمبند کر رہے ہیں۔

ہندو نے ستمبر ۶۵ء میں وہ کچھ کیا اور اس کے جواب میں، حکومتِ پاکستان کے جرأت آفریں عزیمانہ فیصلے، پاکستان کے مایہ ناز جیوش و عساکر کی بے پناہ ہمت، عدیم النظیر حوصلہ، ضیغمانہ للکار، عقابی جھپٹ، استخواں شکن گرفت، عالمتاب کردار ـــــ اور ملتِ پاکستانیہ کے حیرت افزا نظم و ضبط، تعجب انگیز یک نگہی و ہم آہنگی اور خود فراموشانہ جذب و ایثار نے دنیا کو دکھا دیا کہ ۔ ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلمان کہ ہے!
اُس کی اذانوں سے فاشں سرِّ کلیم و خلیل

قوم کے اسی عزم و ثبات اور ہمارے زلزلہ انگیز مجاہدین کی اِسی جانفروشانہ تگ و تاز کا نتیجہ تھا کہ وہی ہندو جو اٹھارہ برس سے اس جنگ کی تیاریوں کے بعد میدان میں آیا تھا، اور اس کی پشت پر اتنی اتنی عظیم مملکتیں، سامانِ حرب و ضرب سے آراستہ و پیراستہ کھڑی تھیں، سترہ دن کے اندر صلح جوئی پر مجبور ہو گیا۔

جنگ کے مقابلہ میں صلح اچھی چیز ہوتی ہے بشرطیکہ صلح، اس مقصد کے حصول کی طرف قدم بڑھانے کا ذریعہ بنے جس کی خاطر جنگ لڑی گئی تھی۔ اس کی دو شکلیں ہوتی ہیں۔ یا تو صلح اُس فاتحانہ انداز کی ہو کہ ہزیمت خوردہ حریف، اپنے موقف کو خود چھوڑ دے اور یوں فریقِ غالب اپنا مقصد حاصل کر لے اور یا اس سے ایسا مہلت کا وقفہ مل جائے جس میں حصولِ مقصد کے لئے از سرِ نو تیاری کر لی جائے۔ ظاہر ہے کہ ۲۳ ستمبر ۶۵ء کی صلح، اول الذکر شکل کی نہیں تھی۔ اس میں نہ تو ہندو، کشمیر سے دستکش ہوا اور نہ ہی ہم اپنے مطالبہ سے دستبردار۔ لہٰذا، یہ صلح درحقیقت مہلت کا وقفہ تھی جس میں ہمیں اتنی تیاری کرنی چاہیئے تھی، کہ جب دشمن سے بارِ دگر الجھنے کی نوبت آئے، تو وہ کشمیر پر اپنے جارحانہ قبضہ سے دستکش ہونے پر مجبور ہو جائے۔

یہ تھی وہ صورتِ حال جس کے پیشِ نظر ہم نے (اس صلح کے بعد) نومبر ۱۹۶۵ء کے لمعات میں لکھا تھا:

> ہاں! ابھی جنگ جاری ہے اور ہمارا خیال ہے کہ جس قوم سے ہمارا واسطہ پڑا ہے اس کی ہمسائگی میں جنگ کا خطرہ ہمیشہ ہمارے سر پر منڈلاتا رہے گا، اس خطرہ کے مٹنے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو (اس قوم کی خوش قسمتی سے) اس میں کوئی ایسا بلند نظر مصلح پیدا ہو جائے جو اسے اس نفسیاتی احساس کہتری (INFERIORITY COMPLEX) کی کشمکش سے نجات دلا کر جس میں یہ صدیوں سے بُری طرح گرفتار چلی آ رہی ہے، انہیں قامتِ آدمیت (HUMAN STATURE)

عطا کردے، اور یا اس پر ہم ایک بھرپور وار کرکے، اس کی فصد اس طرح کھولیں کہ ان کی رگوں سے وہ سارا دفالتو خون بہہ جائے جو ان میں سلام پیدا کر رہا ہے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا ہمیں اپنے آپ کو یہ دھوکا نہیں دینا چاہیئے کہ ہم حالتِ امن میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہمیں اپنے آپ کو مستقلاً جنگ کی حالت میں سمجھنا چاہیئے اور اسی نہج سے زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ ویسے بھی، زندگی کا تو فلسفہ ہی یہی ہے کہ ع

اگر خواہی حیات اندر خطر زی!

اور مسلمان کی تو زندگی ہی، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی کے مطابق، یہ ہے کہ جب جہاد (قتال) ہو رہا ہو تو اس کے اندر شامل ہو اور جب نہ ہو رہا تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔ جہاد (تگ و تازِ مسلسل) تو زندہ رہنے کی بنیادی شرط، اور دشمن کے ہر شر سے بچنے کی اولین صفِ مدافعت ہے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ

جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

قرآن کریم نے جہاد اور قتال میں جو فرق بتایا ہے اس سے، جماعت مومنین کی زندگی کا سارا پروگرام سامنے آجاتا ہے۔ قرآن کی رُو سے، اس جماعت کے سامنے ایک عظیم انقلاب آفریں نصب العین ہوتا ہے — یعنی نوعِ انسان کی حیاتِ اجتماعیہ کی، وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار کے مطابق تشکیلِ جدید — اس نصب العین کے حصول کے لئے مسلسل سعی و عمل اور پیہم تگ و تاز مومن کی زندگی کا شعار ہے۔ اسی سعیٔ پیہم کا نام جہاد ہے (اس لفظ کے معنے ہی کوشش — جد و جہد کے ہیں)۔ یہ جہاد مومن کی زندگی میں سانس کی طرح مسلسل و متواتر جاری رہتا ہے۔ وہ سوچتا ہے تو اسی نہج سے، فیصلے کرتا ہے تو اسی معیار کے مطابق، اور قدم اٹھاتا ہے تو اسی نصب العین کی طرف۔ اس وحدتِ مقصد کا نام ایمان ہے اور اس کی طرف قدم بڑھانے کو اعمالِ صالح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اسی جہدِ مسلسل میں ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب اس جماعت کو شمشیر بکف میدانِ جنگ میں اترنا پڑتا ہے۔ جہاد کی اس خاص منزل کو قتال کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاد، عملِ پیہم ہوتا ہے اور قتال اس کا ایک ہنگامی پروگرام۔ جب یہ ہنگامی پروگرام ختم ہو جاتا ہے تو جہاد پھر اپنی سابقہ رفتار سے مصروفِ جادہ پیمائی ہو جاتا ہے۔

لیکن ہمارے ہاں جو کچھ ہوا، اس سے یہ تاسف انگیز حقیقت سامنے آئی کہ ہم نے جہاد کے مفہوم کو سمجھا ہی نہیں (جذباتی قوموں کی طرح) ہنگامی قتال ہی کو مقصود سمجھ لیا۔ جب جنگ ہوئی تو ہم نے وہ کچھ کر دکھایا جس پر غیر تو ایک طرف، خود ہم بھی محوِ حیرت تھے۔ اور جب جنگ ختم ہو گئی تو ہم پھر اپنی بے حسی

اور بے عملی کی روشِ کہن کی طرف پلٹ گئے۔ اور قوم میں وہ ساری خرابیاں از سرِ نو (بلکہ زیادہ شدت کے ساتھ) اُبھر آئیں، جنہیں جنگ کا سیلاب خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا تھا۔ قوم مقصد فراموشی اور انفرادی مفاد پرستی کے اس تباہ کن راستے پر سرپٹ دوڑے جا رہی تھی کہ اعلانِ تاشقند نے ـــــ سمندِ ناز پہ اک اور تازیانہ ـــــ کا کام دیا۔

ہم نے اُس زمانہ میں بھی لکھا تھا ـــــ اور اب تک کوئی ایسی وجہ سامنے نہیں آئیں جن سے ہم اپنی اس رائے میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کریں ـــــ کہ ہم نے معاہدہ تاشقند سے کچھ کھویا نہیں تھا، بلکہ ستمبر کے معاہدہ کو باعمل بنانے کے لئے کچھ پایا ہی تھا لیکن ہماری بدقسمتی کہ، حکومت کی مشینری کے عدم تدبر نے ملک میں ایسی فضا پیدا کر دی، جس سے دلوں پر مایوسی اور ذہنوں پر مردنی چھا گئی اور اس طرح زندگی کی وہ حرارت جو ستمبر کی ناقابلِ فراموش، حیات بخش، معرکہ آرائی سے بیدار ہوئی تھی، پھر سے افسردہ و پژمردہ ہو گئی۔ یہ وہ جگر خراش و دلسوز حقیقت تھی جس پر خون کے آنسو بہاتے ہوئے ہم نے اپریل ۱۹۶۶ء کے لمعات میں لکھا تھا۔

"یہاں تک تو حالات نے خود بخود کر دیا ـــــ بلکہ یوں کہئے کہ ہمیں ہندوؤں کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے ہماری ایک بہت بڑی مشکل کا حل پیدا کر دیا ـــــ لیکن اس کے بعد ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے کیا کیا، وہ ایک حدیث ہے دل گداز، اور ایک ماجرا ہے خونچکاں ـــــ ہم نے جنگ ختم کی تھی تو اس کے یہ معنے نہیں تھے کہ ہم اور ہندو ایک ہو گئے ہیں۔ ہم نے تو اس سے سیاسی نزاعات مٹانے کی ایک کوشش کی تھی۔ اس سے زیادہ اس کا مفہوم کچھ نہیں تھا۔ لیکن ہم اس باب میں کہاں تک چلے گئے، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ (مثلاً) ہمارے ریڈیو سے ایسے پروگرام نشر ہوا کرتے تھے، جن میں ہندوؤں کی تاریخ، ان کی تہذیب، تمدن، سیاست، ذہنیت کو سامنے لایا جاتا تھا۔ اس میں کوئی بات جھوٹی نہیں ہوتی تھی، خلافِ واقعہ نہیں ہوتی تھی۔ اس کا اثر یہ تھا کہ یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجاتی تھی کہ ہم میں اور ہندوؤں میں کوئی قدر مشترک نہیں، اس لئے ہم اور وہ نہ کبھی ایک تھے، نہ ایک ہو سکتے ہیں۔ لیکن اعلانِ تاشقند کے بعد جب لوگ اسی ریڈیو کو سنتے تھے تو اس میں سے اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی تھیں کہ ـــــ ہندو اور مسلمان بھائی بھائی ہیں، پاکستان کی تشکیل ایسی ہی تھی جیسے دو بھائیوں میں جائیداد کے بٹوارے کا سوال زیرِ غور ہو۔ جائیداد بٹ جانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بھائی ایک دوسرے کا بھائی نہیں رہتا۔ خود یہ جنگ بھی دو بھائیوں میں باہمی تنازعہ تھا۔ تنازعہ ختم ہو گیا اس لئے ہم اور ہندو پھر ایک ہو گئے ـــــ اس پر پہلے تو لوگ سمجھتے کہ انہوں نے شاید کسی غلط اسٹیشن پر سوئی گھما دی ہے،

لیکن جب انہیں یقین ہو جاتا کہ وہ آواز فی الواقعہ پاکستان ریڈیو کی ہے تو وہ دم بخود رہ جاتے کہ ــــ یاالٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟ صبح اٹھ کر جو اخبارات دیکھتے تو ان میں بھی اس بھائی چارہ کی خوش خبریاں سامنے آتیں۔

پاکستان کا بلند اساسی مقصد و مفہوم تو ایک طرف، اِس قسم کے اعلانات و "تبشیرات" کے ذمہ دار ارکان نے اتنا بھی نہ سوچا کہ جنگ کی وجہ سے قوم کا جذبۂ علیحدگی کس قدر شدت اور نزاکت اختیار کر چکا ہے۔ ان حالات میں دفعتاً اس قسم کے اعلانات قوم کے اندر کس نوعیت کی نفسیاتی تبدیلی پیدا کر دیں گے اور اس فوری تبدیلی کا نتیجہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد ملک میں ایسی فضا پیدا کر دی گئی جس میں ہندو کو ہندو کہنا بھی گالی کے مرادف سمجھ لیا گیا اور وہاں کے سیاسی راہنماؤں کی کسی حیلہ جوئی اور فریب کاری کی طرف اشارہ تک کرنا "مہا پاپ" قرار دے دیا گیا ــــ اُن سیاسی راہنماؤں کی جن کے متعلق خود ہندوستان کے اخبارات یہ کچھ کہہ رہے تھے کہ

> شاستری حکومت ایک ایسا سانپ ہے جس کے سینکڑوں منہ ہیں اور ہر منہ میں زبان الگ الگ بولی بولتی ہے اور ہم فانی انسان اسکا فیصلہ ہی نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کس کی بات مستند سرکاری اعلان ہے اور کس کی نہیں۔ حساس طبائع نے اندازہ لگایا ہوگا کہ حکومت کا سربراہ ــ مسٹر شاستری ــ خود اس کائیں کائیں کا منجھا ہوا فنکار ہے۔
>
> (نیوایج ــ بحوالہ پاکستان ٹائمز ۵ ستمبر)

ہندوستان کے ساتھ ہمارے اختلافات کے سلسلہ میں سب سے اہم شق یہ تھی کہ بھارت کی طرف سے کشمیر کے مسلمانوں پر بے انتہا مظالم ہو رہے ہیں اور ہمارا فریضہ ہے کہ ہم ان مظلوموں کی امداد کریں۔ ان مظلوموں پر ظلم و ستم کے واقعات ریڈیو صدائے کشمیر اور ریڈیو پاکستان سے مسلسل نشر ہوتے تھے اور ہمارے اخبارات کے صفحات ان لرزہ انگیز داستانوں سے خونچکاں رہتے تھے لیکن اعلانِ تاشقند کے بعد اس سلسلہ میں ایک حرف بھی سننے میں نہیں آیا۔ ایسا نظر آتا ہے جیسے اعلانِ تاشقند ایک ایسا تیر بہدف تعویذ تھا جس سے اس بے کس و بے بس مریض کے تمام دُکھ دور ہو گئے ہیں اور اسی لئے اس کے کراہنے کی کوئی آواز فضا کو مرتعش نہیں کرتی ــــ کشمیر کے مظلوموں کے ساتھ ہی، ہندوستان کے مسلمانوں پر مظالم و تشدد کی داستانوں کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا ہے اور اب ان کے متعلق بھی کچھ سننے میں نہیں آتا ــــ اب ہندو اور مسلمان بھائی بھائی ہیں، خواہ وہ مسلمان پاکستان کے ہوں یا کشمیر کے، یا خود

ہندوستان کے، اب ہم میں اور ہندوؤں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں رہا بس سیاسی نوعیت کے چند جزئی اختلافات ہیں جو رفتہ رفتہ حل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ تھیں وہ "تاثرات جو اعلانِ تاشقند کے بعد اس ملک میں عام کر دیئے گئے ہیں۔

خود اعلانِ تاشقند کی خبریں جس بے تدبیری سے نشر اور شائع کی گئیں، اس سے ہماری جیتی ہوئی بازی ہر گئی اور قوم پر مایوسی اور بد دلی کی ایسی فضا مسلط ہو گئی جس کے "تاثرات، ہزار جتن کرنے کے باوجود اب تک زائل نہیں ہو سکے"

چنانچہ اس سے رفتہ رفتہ قوم کی یہ حالت ہو گئی کہ اب ؎

نہ وہ غزنوی میں مذاق ہے نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

ایسا نظر آتا ہے کہ ستمبر ۱۹۶۵ء کے سترہ دن کا عرصہ ایک حسین خواب تھا جس میں قوم کی سوئی ہوئی قسمت بیدار ہی نہیں، شباب پر تھی — اور اس کے بعد، قوم اُس خوابِ سے بیدار ہو گئی اور اس کی قسمت پھر سو گئی — پہلے سے بھی زیادہ گہری نیند سو گئی۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ اس قوم کی قسمت کو بیدار رکھنے کے لئے ہنگامی صورِ اسرافیل کی نہیں، مسلسل شورِ قیامت کی ضرورت ہے۔

لیکن بھلا ہو ہندو کی کم ظرفی اور اوچھے پن کا جس سے وہ (اپنے حمایتیوں کی ذرا سی شہ پاکر) اس قسم کی بے ہنگم حرکات کرنے لگ جاتا ہے جس سے اس کے چہرے پر پڑا ہوا نقاب خود بخود سرک جاتا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا، کہ ہندو شام کے وقت، مندروں میں اپنے ٹھاکروں (دیوتاؤں) کو جگایا کرتے تھے۔ اس کے لئے وہ گھنٹے، گھڑیاں، ناقوس، بگل، جھانجھ، ناقوس، بیک وقت سب کے سب، اس زور سے بجاتے تھے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس سے ان کے ٹھاکر جاگتے تھے یا نہیں، لیکن مندر کے اردگرد کے گھروں کے بچے چونک کر ضرور جاگ اٹھتے تھے۔ ان کے سیاسی مندروں میں اس قسم کی "دیوتا بیداری" سے ہماری ساکت و صامت فضا میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے جس کے لئے ہمیں ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ چنانچہ آجکل ان کے شور و غوغا سے ہمارے ہاں پھر کچھ حرکت کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ خدا کرے کہ ان کا پیدا کردہ یہ شور، مسلسل قائم رہے تاکہ ہماری قسمت کو آنکھ جھپکنے کی فرصت نہ مل سکے۔

اس حقیقت کو بار بار دہرانے کی بجائے ایک ہی بار، اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ ہندو کو میدان جنگ میں شکستِ فاش دیئے بغیر پاکستان کا استحکام کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اور جب پاکستان کا استحکام

جنگ کے بغیر ممکن نہیں، تو کشمیر کا مسئلہ جنگ کے بغیر کیسے حل ہو جائے گا؟ یہ جنگ کب کرنی چاہیئے، اس کا فیصلہ حکومت ہی کر سکتی ہے، اس لئے کہ اس فیصلہ تک پہنچنے کے لئے بہت سے ایسے امور کو سامنے رکھنا پڑتا ہے جو پبلک کی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ لیکن، یہ جنگ جب بھی ہو، ضرورت اس امر کی ہے کہ قوم کو برابر "جنگ کی فضا" میں رکھا جائے۔ جنگ کی فضا سے یہ مراد نہیں کہ انہیں "شیر آیا، شیر آیا" کہہ کر ڈراتے رہنا چاہیئے۔ اس سے مراد کچھ اور ہے اور اسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ گزشتہ جنگ کے دوران قوم کی حالت میں جو خوشگوار انقلاب آیا تھا، اس کی وجہ کیا تھی؟

ہمیں ۱۹۴۷ء میں آزادی تو مل گئی تھی لیکن حکومت اور عوام میں وہی بُعد رہا جو انگریزوں کے زمانے میں تھا۔ اُس زمانے میں حکومت غیروں کی تھی اس لئے حکومت کا ذکر آتے ہی خیال غیروں کی طرف منتقل ہو جاتا تھا اور قدم قدم پر یہ احساس دامنگیر ہو جاتا تھا کہ حکومت اور ہے اور ہم اور۔ اور ہمارا اور حکومت کا کچھ بھی مشترک نہیں۔ حکومت کے مفاد اور ہیں اور ہمارے مفاد اور۔ حکومت کا نقصان اور ہے اور ہمارا نقصان اور۔ بلکہ یوں کہیئے کہ جس بات میں حکومت کا فائدہ ہے اس میں ہمارا نقصان ہے۔ اور جس میں حکومت کا نقصان ہے اس میں ہمارا فائدہ ہے۔ اُس وقت حالت یہ تھی کہ جو شخص حکومت کی حمایت میں بات کرتا تھا اُسے "اپنوں" میں سے نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جو حکومت کے خلاف ہوتا اسے قوم کا ہمدرد اور محب وطن خیال کیا جاتا۔ دوسری طرف حکومت کے دفتر کا چپڑاسی اور چونگی کا محرر بھی اپنے آپ کو قوم سے الگ، اور حکومت کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے قوم سے برتر تصور کرتا تھا۔ غرضیکہ قوم اور حکومت کے درمیان ایک بڑی وسیع خلیج حائل تھی جسے وسیع رکھنے ہی میں حکومت اپنا فائدہ سمجھتی تھی۔

۱۹۴۷ء میں انگریز چلا گیا اور حکومت ہماری اپنی ہوگئی۔ لیکن حکومت اور عوام میں جو بُعد اور مغائرت پہلے تھی وہ بدستور باقی رہی بلکہ دن بدن بڑھتی ہی چلی گئی۔ چنانچہ اب تک بھی کیفیت ہے کہ عمال حکومت اپنے آپ کو "افسر، حاکم" سمجھتے ہیں اور عوام کو "رعایا"۔ ان کے ساتھ اُن کا سلوک اور رویہ بالکل ویسا ہی ہوتا ہے جیسا شکن بر جبین، مستبد انگریز حاکم کا ہوتا تھا ــــ اس فرق کے ساتھ کہ انگریز کے ماتھے کے شکن مستقل ہوتے تھے اور ہمارے حکام کے یہ فولادی شکن "چاندی، سونے کی حرارت" سے نرم پڑ جاتے ہیں۔ اسی لئے رشوت اب معاشرہ کے معمولات میں سے ہوگئی ہے۔ غریب اب بھی اسی طرح مارے مارے پھرتے ہیں اور ان کی رسائی تو ایک طرف شنوائی بھی کہیں نہیں ہوتی۔ وہ حکومت کی مشینری کے ادنیٰ سے پرزے سے بھی ڈرے ڈرے، سہمے سہمے رہتے ہیں۔ دوسری طرف جس شخص کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ

یہ "حکومت کا آدمی" ہے اس کے متعلق معاشرہ کے ذہن میں اسی قسم کے تصورات اُبھرتے ہیں جس قسم کے خیالات انگریز کے زمانے میں سرکار پرست، "ٹوڈی" کے متعلق دل میں پیدا ہوتے تھے۔ جو شخص حکومت کے کسی اچھے کام پر بھی اس کی تعریف کر بیٹھے، اُسے شک و شبہ کی نگاہ اور حقارت و نفرت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کے خلاف جا و بے جا تنقید کرنا، معاشرہ میں قابلِ تعریف بننے اور واجب الاحترام قرار پانے کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جو جتنے زیادہ تلخ انداز سے حکومت پر تنقید (بلکہ اس کی مذمت) کرتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ حریت مآب اور محبِ قوم سمجھا جاتا ہے۔

قوم اور حکومت میں یہ بُعد مسلسل چلا آ رہا تھا کہ جنگ کا زلزلہ آیا اور ایک ہی جھٹکے میں کیا دیکھتے ہیں کہ یہ خلیج نہ صرف تنگ ہو گئی بلکہ بڑی حد تک پٹ گئی۔ حکومت نے لوگوں کو اپنے اعتماد (CONFIDENCE) میں لے لیا۔ حکام اپنے آپ کو عوام میں سے سمجھنے لگے۔ ان کے ماتھے کی تیوریاں، لبوں کے تبسم میں بدل گئیں۔ اس تبسم اور احساسِ یگانگت کا نتیجہ تھا کہ رشوت ختم ہو گئی۔ عمالِ حکومت نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ وہ تنخواہ ہی اس بات کی پاتے ہیں کہ لوگوں کا کام کریں۔ انہوں نے اپنے اندر یہ تبدیلی پیدا کی، اور عوام (رشوت کے روپوں کی جگہ) ان کی خدمت میں اپنے دیدہ و دل پیش کرنے لگے۔ اُس "خلیج" کے زمانہ میں لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حکومت جو کچھ اُن سے وصول کرتی ہے وہ افسروں، حاکموں کی جیب میں چلا جاتا ہے۔ اس لئے ہر شخص کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ حکومت کے واجبات کی ادائیگی کو کسی نہ کسی طرح ٹال جائے، بلکہ اُن سے بچ ہی نکلے۔ اگر کسی سرکاری پیپر کا نقصان ہوتا تھا تو راہ رو اُسے دیکھ کر عجب بے اعتنائی سے یہ کہتے ہوئے گذر جاتے تھے کہ یہ مال حکومت کا ہے، ہمارا تھوڑا ہے۔ جاتا ہے تو جانے دو۔ لیکن جنگ کے دوران جب انہوں نے دیکھا کہ جو کچھ حکومت ان سے لیتی ہے، وہ خود انہی کے کاموں پر صرف کر رہی ہے تو حکومت نے اگر دس مانگے تو انہوں نے سو دیئے۔

آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اٹھارہ برس تک فوج کے متعلق عام تاثرات اس قسم کے تھے کہ یہ ہٹے کٹے، نوجوان، قوم کی کمائی کا بہترین حصہ، بیکار بیٹھے، مفت میں کھا جاتے ہیں۔ ان سے کوئی کام لینا چاہیئے۔ ان سے نہریں کھدوانی چاہئیں۔ ان سے سڑکیں کٹوانی چاہئیں۔ جب دو سال اُدھر فوجیوں کی تنخواہوں میں اضافہ ہوا ہے تو ملک میں ہر طرف چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ قوم کی گاڑھے پسینے کی کمائی کس بیکار مد میں لٹائی جا رہی ہے۔ لیکن ۶ ستمبر کے بعد یہی سپاہی تھے کہ ملک کے ہر فرد کا جی چاہتا تھا کہ جن راہوں سے یہ گذریں، اپنی جان و مال ان راہوں پر سے نچھاور کر دیا جائے۔ اگر کوئی سپاہی سگریٹ کا ایک پیکٹ خریدنا چاہتا تو غریب خوانچہ والا، اپنا سارا خوانچہ اس کی جیب میں انڈھیل دیتا۔ لوگ رات رات بھر

پھولوں کے ہار، شربتوں کی بوتلیں اور پکوان کی دیگیں لئے راستوں میں کھڑے رہتے کہ شاید ادھر سے فوجیوں کا کوئی دستہ گذرے۔ یہ تبدیلی کیوں واقعہ ہوئی۔ محض اس لئے کہ ہر شخص کو اس کا یقین تھا کہ قوم کا سپاہی جو کچھ کر رہا ہے اس میں اُس کا اپنا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ سب ہمارے فائدے کے لئے ہے۔

اسے پھر سن رکھیئے کہ قوم کے قلب و نگاہ میں یہ محیر العقول تبدیلی اس لئے پیدا ہو گئی تھی کہ وہ جانتی تھی کہ سپاہی جو کچھ کر رہا ہے اس میں اُس کا اپنا ذاتی فائدہ کچھ نہیں۔ وہ سب کچھ قوم کے فائدے کے لئے کر رہا ہے ـــ جو فرد، جو لیڈر، جو پارٹی، جو حکومت، قوم کے دل میں یہ تاثر پیدا کر دے۔ کہ وہ جو کچھ کرتی ہے اپنے فائدے کے لئے نہیں، ہمارے فائدے کے لئے کرتی ہے، ـــ قوم اپنا جان و مال اس پر سے نچھاور کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے ـــ یہی تھی وہ عظیم حقیقت جو گذشتہ جنگ میں ہمارے سامنے آئی ـــ!

یہ تھا وہ تاثر جو جنگ کے دوران قوم کے دل میں پیدا ہوا اور جو نتیجہ تھا اس بات کا کہ قوم اور حکومت کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں رہی تھی۔ لیکن جنگ کے تھوڑے ہی دنوں بعد، عمال حکومت نے پھر وہی روش اختیار کر لی اور اس پٹی ہوئی خلیج کو پھر سے کھودنا شروع کر دیا، اور دیکھتے ہی دیکھتے پھر سے وہی سابقہ بُعد اُبھر آیا۔ بلکہ اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ ـــ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ان عمال حکومت کو اس کا افسوس تھا کہ انہوں نے جنگ کے زمانے میں عوام کو اس قدر اپنے قریب کیوں آنے دیا؟ جب یہ بُعد بڑھا تو اس سے پیدا شدہ خرابیاں اور بھی زیادہ بڑھ گئیں۔

جنگ سے پہلے، ریل، تار، ٹیلیفون، بجلی، ہسپتال، ڈاک خانہ، غرضیکہ پبلک کے ہر رفاہی ادارے کے خلاف شکایات کی بھرمار رہتی تھی۔ جنگ شروع ہوئی تو ہر ایک کو خدشہ تھا کہ جو ادارے امن کے زمانے میں اس قدر نقائص سے بھرپور ہیں، جنگ کے زمانے میں نہ معلوم ان کی حالت کیا ہو جائے گی؟ لیکن لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ جنگ کے سترہ دنوں میں ان محکموں کے خلاف کوئی ایک شکایت بھی پیدا نہ ہوئی۔ یہ اس قدر حسن و خوبی سے اپنے فرائض ادا کرتے رہے کہ کسی کو اس کا گمان تک نہ تھا۔ اور تو اور ـــ جنگ کے دنوں میں، ملک میں جرائم ختم ہو گئے۔ کہیں کوئی واردات نہیں ہوئی۔ لیکن جنگ کے بعد، یہ تمام خرابیاں اس شدت کے ساتھ ابھریں جیسے برسات کی بارش کے بعد مینڈک اور مچھر ہجوم کر کے آجاتے ہیں۔

اسی ہجوم میں وہ لوگ بھی یلغار کر کے آگے بڑھ آتے ہیں جن کا مقصد ملک میں ابتری پیدا کرنا اور انتشار

پھیلانا ہوتا ہے۔ یہ حکومت پر تنقید کرتے ہیں تو بغرض اصلاح نہیں بلکہ محض اس لئے کہ حکومت کو کسی نہ کسی طرح بدنام کر دیا جائے۔ دوسری طرف، جب حکومت اور عوام میں بُعد پیدا ہو جائے تو حکومت بھی زیادہ ذکی الحس (TOUCHY) ہو جاتی ہے۔ اس سے اُس میں ٹھنڈے دل سے صحیح فیصلے کرنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ اس کشمکش میں ملک کی جو حالت ہوتی ہے، زمانہ بعد از جنگ کے واقعات اس پر شاہد ہیں۔

ملک میں جو پارٹیاں اپنے آپ کو احزاب مخالف کی اصطلاح سے تعبیر کرتی ہیں، ہم ان کی خدمت میں گزارش کریں گے کہ وہ سوچیں (اور اپنا محاسبہ کریں) کہ انہوں نے قوم کی بہبود کے لئے کیا کچھ کیا ہے، ہم نے اوپر یہ کہا ہے کہ جو فرد، جو لیڈر، جو پارٹی، قوم پر ثابت کر دے کہ وہ جو کچھ کرتی ہے قوم کی بہبود کے لئے کرتی ہے، اپنے لئے نہیں کرتی، قوم اس پر جان و دل نچھاور کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے سوال یہ ہے کہ احزاب مخالف نے قوم کے لئے کیا کیا ہے جس سے وہ قوم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کا ساتھ دے۔ ان کا ئلے دے کے ایک ہی مطالبہ ہے، اور وہ یہ کہ ملک میں صدارتی نظام کے بجائے پارلیمانی نظام قائم ہونا چاہیئے۔ لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ پارلیمانی نظام کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ حکومت کے وزراء اراکین پارلیمان میں سے لئے جاتے ہیں۔ اس سے وہ لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ لوگ صدارتی نظام کے محض اس لئے مخالف ہیں کہ اس نظام میں ان کے لئے وزارت کی کرسیاں حاصل کرنے کا امکان نہیں اور پارلیمانی نظام اس لئے چاہتے ہیں کہ اس میں وزارت کے چند قلمدان ان کے سپرد ہو جائینگے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ان پارٹیوں میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں جو اس سطح سے بلند ہو۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ حضرات سوچیں کہ جب ان کے متعلق قوم کا یہ تأثر ہو — اور ان کے مطالبہ اور سرگرمیوں کے پیش نظر، وہ اپنے اس تأثر میں حق بجانب بھی ہو — کہ یہ ساری لڑائی ہوس اقتدار کی پیدا کردہ ہے، تو قوم ان کا ساتھ کیوں دے؟ یہ حضرات اپنے اس مطالبہ اور طرز عمل سے، ملک میں ہنگامے تو برپا کرا سکتے ہیں، قوم کے دلوں پر اپنا کوئی مستقل نقش نہیں چھوڑ سکتے۔ مستقل نقش چھوڑنے کا تو ایک ہی طریق ہے اور وہ یہ کہ

وَ اَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ۔ (۱۳/۱۷)

زمین میں بقا اسی کے لئے ہے جو نوع انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔

حکومت ہو یا حزب مخالف، جو اس معیار پر پورا نہیں اترتا بقائے دوام اس کے حصے میں نہیں آسکتی، نہ ہی اس باب میں، پبلک کو محض "بیان بازی" سے زیادہ عرصہ تک فریب میں رکھا جا سکتا

ہے۔ جن لوگوں کی ذہنیت یہ ہو کہ ۔ يُحِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا ۔ (۳/۱۸۸) "جو چاہتے یہ ہیں کہ لوگ ان کاموں کی وجہ سے ان کی تعریف کریں جو وہ کر کے نہیں دکھاتے" وہ لوگوں کے دل پر اپنا نقش دوام نہیں چھوڑ سکتے۔

فطرت لہو ترنگ ہے، ناداں نہ چل ترنگ

جب ہم نے کہا تھا کہ قوم کے لئے سلامتی کی راہ ایک ہی ہے، اور وہ یہ کہ اسے مستقل طور پر حالت جنگ میں رکھا جائے، تو اس سے ہمارا مقصد یہی تھا کہ۔

(۱) جس طرح جنگ کے زمانے میں حکومت اور عوام میں بُعد اور مغائرت نہیں رہی تھی وہی کیفیت پھر سے پیدا کی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ حکومت، قوم کو اپنے اعتماد (CONFIDENCE) میں لے۔ یعنی وہ جو فیصلے کرے، ان کی غرض و غایت، علت و حکمت، اثرات و عواقب، ملک پر اس طرح واضح کرے کہ اسے یقین اور اطمینان ہو جائے کہ یہ فیصلے ملک اور قوم کی بہتری کے لئے کئے گئے ہیں۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ حکومت جو اقدامات کرتی ہے، ملک کو ان کی حکمت و غایت کا علم نہیں ہوتا۔ اس لئے ہر شخص ان کے متعلق قیاس آرائی سے کام لیتا ہے اور انہی قیاس آرائیوں کی بنا پر، انتشار پسند طبقہ حکومت کے خلاف بدظنی پھیلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اگر ملک کو ان اقدامات کے اغراض و مقاصد اور علل و حکم سے واضح طور پر آگاہ کر دیا جائے، تو اس سے بدظنی پھیلنے کے امکانات بہت کم ہو جائیں گے۔ اس سے یہ مقصد نہیں کہ جن رازوں کا قبل از وقت افشا کرنا قرین مصلحت نہیں ہوتا، انہیں بھی پبلک میں عام کر دیا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ جو اقدامات ایسے نہ ہوں ان کی علت و حکمت سے عوام کو پوری طرح آگاہ کر دیا جائے۔ اور جو راز قابل افشا نہ ہوں ان کے متعلق عمومی حیثیت سے گفتگو کر کے قوم کو مطمئن رکھا جائے۔

دوسرا کرنے کا کام یہ ہے کہ سرکاری ملازمین کے دل میں بار بار اس حقیقت کو نقش کیا جائے کہ وہ پبلک کے ملازم ہیں اور پبلک ہی کے پیسے سے انہیں تنخواہ ملتی ہے: سرکار کے پاس تو کسی کو دینے کے لئے ایک پائی بھی نہیں ہوتی۔ وہ پبلک ہی سے لے کر ہر ایک کو دیتی ہے۔ سو جب صورت یہ ہے کہ یہ پبلک کے ملازم (PUBLIC SERVANTS)[1] ہیں تو پھر ان کا پبلک پر "حکومت" کرنے کا کیا

---

[1] ان کے لئے خود حکومت کی تجویز کردہ اصطلاح یہی ہے۔ سو جب حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات "پبلک سرونٹس" ہیں تو ایک سرونٹ (ملازم) کا اپنے آقا پر حکومت کرنے کا تصور ہی باطل ہے۔

سوال ؟ ــ حکومت اور عوام کے درمیان خلیج اسی صورت میں پٹ سکتی ہے جب عمالِ حکومت کے زاویہ نگاہ میں یہ تبدیلی پیدا ہو جائے۔ اس تبدیلی سے وہ خرابیاں بھی بڑی حد تک دور ہو جائیں گی جو اس وقت حکومت کی مشینری کا گویا معمول بن چکی ہیں، اور جن کے دور کرنے کے سلسلہ میں (ایسا نظر آتا ہے جیسے) حکومت بھی اپنے آپ کو بے بس پاتی ہے۔ جس دن ملازم سرکار نے اپنے آپ کو پبلک کا خادم تصور کر لیا، اس دن یہ مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔ وہ کون سا صاحبِ عقل و ہوش ہے جو اپنے دیانتدار خادم کی قدر نہیں کرتا۔ انسان تو ایک طرف، کوئی شخص، گھر کی رکھوالی کرنے والے کتے کو بھی نہیں دھتکارتا۔ لیکن جب کتا خود گھر والوں کو ہی کاٹنے دوڑے، تو اسے کون قریب آنے دے گا؟ یہ تھی وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہم نے (فروری کے طلوع اسلام کے لمعات میں) علامہ اقبال کے الفاظ میں کہا تھا کہ ؎

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن، بہ نوائے دل نوازے

تفسیر اکرنے کا کام یہ ہے کہ ملک میں ایسی معاشی تبدیلی پیدا کی جائے جس سے غریب اور نادار یہ عملاً محسوس کرے کہ ملک کی ترقی میں سے اس کے حصے میں بھی کچھ آتا ہے۔ اس وقت عوام کا احساس یہی ہے (اور وہ ایسا محسوس کرنے میں برحق ہیں) کہ جسے ملک کی ترقی اور قوم کی خوشحالی کہا جاتا ہے وہ درحقیقت چند خاندانوں کی زراندوزی ہے۔ اس سے امیر، امیر تر ــ اور غریب، غریب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ قوم کا متوسط طبقہ، جو درحقیقت قوم کی روایات کا امین اور اس کی اقدار کا حامل ہوتا ہے، آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے اور غریب اور امیر میں اس قدر بُعد پیدا ہو رہا ہے کہ ان میں کوئی قدر مشترک باقی ہی نہیں رہی۔ یہ بُعد، سرکاری ملازمین کے پیدا کردہ بُعد سے بھی زیادہ وسیع اور خطرناک ہے۔ اس کا دور کرنا اشد ضروری ہے ورنہ نہ تو آپ پاکستانی مسلمانوں کو (محض اسلام کے نام کا ورد کرنے سے) ایک قوم بنا سکیں گے اور نہ ہی انہیں اجتماعی مفاد کی خاطر کسی قربانی کے لئے آمادہ ــ سوچئے، کہ یہ نکتہ بڑی گہری سوچ کا متقاضی ہے۔

چوتھا کرنے کا کام یہ ہے کہ ہمیں کشمیر کا مسئلہ دنیا کے سامنے جیسے چاہیے نہیں پیش کرنا چاہیئے ہمیں واضح، غیر مبہم الفاظ میں ببانگِ دہل کہنا چاہیئے کہ ہندوؤں کا یہ کہنا کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے، کھلا ہوا جھوٹ اور خلافِ حقیقت پروپیگنڈہ ہے۔ انہوں نے خود اس کا اعتراف اور اعلان کر رکھا ہے کہ کشمیر کا

مسئلہ فیصلہ طلب ہے اور یہ فیصلہ کہ وہ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ، اہلِ کشمیر کی آراء کے مطابق ہوگا۔ ہندوستان نے اس کا اقرار کر رکھا ہے اور پاکستان نے اہل کشمیر کو یہ عہد و پیمان دے رکھا ہے کہ ہم انہیں ان کا یہ حق دلا کر رہیں گے۔ ہندوستان اپنے اقرار سے منحرف ہوتا ہے اور ہم اپنے وعدے کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ یہی ہندوستان اور پاکستان کے درمیان تمام اختلافات کی اصل و بنیاد ہے۔ جب تک ہندوستان، اہل کشمیر کو اپنے متعلق آپ فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیتا، ہماری ہندوستان کے ساتھ صلح ہو نہیں سکتی۔ ہم ہندوستان کے ساتھ بات چیت بھی کرنا چاہتے ہیں تو صرف اس مسئلہ پر کہ کشمیر میں (PLEBISCITE) کا طریق کیا ہونا چاہیئے۔ اگر وہ اس سوال کو باہمی گفتگو سے حل کرنا چاہتے ہیں تو بسم اللہ لیکن اگر وہ اس کے لئے تیار نہیں تو پھر اس کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوگا۔ اس لئے کہ ہم مر تو دے سکتے ہیں، اہل کشمیر کو جو قول دے رکھا ہے اس سے نہیں پھر سکتے کہ یہی ہمارے خدا کا حکم ہے۔

کشمیر کے متعلق، ہمیں ساری دنیا کو یہ سنا دینا چاہیئے اور بار بار بتلا دینا چاہیئے۔ مبہم الفاظ حق کو باطل بنا دیتے ہیں اور یہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔ ہمیں دو ٹوک بات کرنی چاہیئے۔

---

(۲) یہ کہنے سے کہ قوم کو مستقل طور پر حالتِ جنگ میں رکھنا چاہیئے، ہمارا دوسرا مقصد یہ تھا کہ ہندو کے ساتھ، معاہدات کی حد تک بے شک تعلقات استوار رکھے جائیں، لیکن قوم کو مسلسل اور متواتر بتایا جائے کہ ہندو قوم قطعاً قابلِ اعتماد نہیں۔ اس کی طرف سے ہر وقت چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ ان کی تاریخ، ان کے نظریاتِ زندگی، ان کا تمدن، ان کی سیاست، ان کی ذہنیت ایسی ہے کہ انسانیت کو ان سے ہر وقت خطرہ ہے۔ اس قوم کو نہ خود قامتِ آدمیت نصیب ہوئی ہے، نہ یہ احترامِ آدمیت کے تصور سے آشنا ہیں ان خیالات کے عام کرنے کے لئے تمام ذرائع نشر و اشاعت استعمال کئے جائیں اور اس قسم کے لٹریچر کو اپنے نصابِ تعلیم میں داخل کیا جائے۔

اس مقصد کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہندوستان کے ذمہ دار افراد، پاکستان کے خلاف جو غلط جھوٹا پروپیگنڈہ کریں، اسے بلا کم و کاست، انہی کے الفاظ میں، اپنی پبلک کے سامنے پیش کیا جائے۔ اور اس کے بعد نہایت سنجیدہ الفاظ میں اس کی تردید کی جائے۔ یہ ہمارے ریڈیو کا مستقل فیچر ہونا چاہیئے۔

اور آخر میں ایک گزارش ملتِ پاکستانیہ (اپنی پبلک) سے بھی ہے اور وہ یہ کہ

"دشمن ہر وقت ہماری گھات میں ہے"

سابقہ جنگ نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ لڑائیاں صرف فوجی طاقت کے بل بوتے پر نہیں لڑی

بانتیں ۔ اس میں قوم کی یک جہتی اور ہم آہنگی کا عنصر سب سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔ آپ نے جنگ کے دوران جس یک جہتی کا ثبوت دیا تھا اسی میں ہماری کامیابی کا راز مضمر تھا۔ لیکن آپ نے اس کے بعد اس گراں بہا متاع کو ضائع کیوں کر دیا؟ کیا آپ نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارا مقصد حاصل ہو گیا ہے' اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی؟ اگر آپ نے ایسا سمجھا ہے تو یہ آپ کی سخت بھول ہے ۔ جنگ اب بھی جاری ہے اور مسلسل جاری رہے گی ۔ آپ کو اس متاع گراں بہا کی اب بھی ضرورت ہے اور مسلسل ضرورت رہے گی ۔ اس لئے جو کچھ آپ نے جنگ کے دوران کر کے دکھایا تھا اسے زندگی کی مستقل روش بنا لیجیے۔ ملک کی انتظامی مشینری میں جو خرابیاں ہیں انہیں دور کرنے کی کوشش کیجیے۔ ان سے بددل ہو کر انتشار پسندوں کی شرانگیزیوں کا شکار نہ ہو جائیے ۔۔ یاد رکھیے! انتشار پسند عناصر نہ آپ کے دوست ہیں نہ پاکستان کے بہی خواہ!

جو کچھ ہم نے کہا ہے، اس کا ملخص یہ ہے کہ ہمیں اس خود فریبی سے جلد نکل جانا چاہیئے کہ بھارت اور پاکستان کی جنگ ۲۳ ستمبر کو ختم ہو گئی اور اعلان تاشقند نے اس پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی ۔ یہ جنگ مسلسل جاری ہے اور جاری رہے گی تا وقتیکہ یہ فیصلہ کن مرحلہ تک نہ پہنچ جائے اور زندگی اور موت کا فیصلہ قرآن کریم کے اس معیار کے مطابق نہ ہو جائے جس میں اس نے کہا ہے کہ

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَ يَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ - (۸/۴۲)

جس نے زندہ رہنا ہے وہ اپنی زندگی کا ثبوت بہم پہنچا کر زندہ رہے ۔ اور جسے مرنا ہے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اس میں واقعی زندہ رہنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی تھی ۔

اور اپنی زندگی کے ثبوت بہم پہنچانے کا اس کے سوا اور کیا طریقہ ہے کہ ،

اگر خواہی حیات اندر خطر زی

خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا - (۶۷/۲)[1] کی یہی تفسیر ہے

(۲)

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ ہمارے ہاں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ حکومت' ملک کے انتظام و استحکام کے

---

[1] زندگی اور موت پیدا ہی اس لئے کی گئی ہے کہ اس بات کا ٹسٹ ہوتا ہے کہ کون زندگی بخش صلاحیتوں کا مالک ہے۔

سلسلہ میں جو اقدامات کرتی ہے، ان کی غرض وغایت اور علت وحکمت کو پبلک کے سامنے نہیں لاتی۔ اس سے بعض اوقات بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوجاتی ہیں اور انتشار پسند عناصر کو بد دلی پھیلانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔ اتفاق سے ہمارے سامنے (اس سلسلہ میں) ابھی ابھی ایک واقعہ آگیا ہے جسے ہم بطور مثال پیش کرتے ہیں۔ حال ہی میں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ حکومت مغربی پاکستان نے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے ماتحت "سید ابوالاعلےٰ مودودی صاحب کا ایک کتابچہ" اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی" ضبط کر لیا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ضابطہ کے ان رسمی الفاظ کے علاوہ جن کے ساتھ حکومت کے اِس قسم کے احکامات صادر ہوتے ہیں، اس امر کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی کہ اس کتابچہ کی اشاعت سے ملک کو کیا نقصان پہنچتا ہے اور اس کی ضبطی کس طرح پاکستان کے فائدے کے لئے ضروری تھی۔ حکومت کو اس کا اچھی طرح علم ہے کہ جماعت اسلامی کی پراپیگنڈہ مشینری کسقدر وسیع وعریض ہے اور اس پر وہ کسقدر روپیہ بے دریغ صرف کرتی ہے۔ چنانچہ حکومت کے اس اقدام پر اِس جماعت کی یہ مشینری اپنے پورے زور شور سے حرکت میں آگئی اور ملک میں نہایت تیزی سے یہ خیال پھیلا دیا گیا، کہ ذرا سوچئے، کہ یہ کہنے سے، کہ ہمارے نزدیک خاندانی منصوبہ بندی خلافِ شریعت ہے، پاکستان کے دفاع کو کون سا خطرہ لاحق ہو سکتا تھا جس کی بنا پر ہماری زبان بندی کر دی گئی؟ یہ بات ایسے معصومانہ انداز میں کہی جارہی ہے (اور نظر بظاہر ہر بھی جی لگتی ہوتی) کہ عوام اس سے فوراً متاثر اور جماعتِ اسلامی کے ہمنوا ہوجاتے ہیں کہ واقعی حکومت بڑی دھاندلی کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ کہ حکومت نے جس خطرہ کی روک تھام کے لئے اس کتابچہ کو ضبط کیا ہے، اس اقدام سے اس کی روک تھام ہوگئی ہے یا نہیں، یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا ۔ لیکن یہ تو یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ اس سے جماعتِ اسلامی کو حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کا ایک اور موقعہ ہاتھ آگیا ہے۔ چنانچہ وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہی ہے۔ مودودی صاحب کے حاشیہ نشینوں نے اس پر کیا کچھ کہا ہے، اسے تو چھوڑیئے۔ خود مودودی صاحب کا بیان ملاحظہ فرمایئے۔ انہوں نے کہا ہے۔

> آج ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت میرا ایک پمفلٹ ضبط کیا گیا ہے جسکا نام "اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی" ہے۔ یہ مضمون کئی سال سے شائع ہوتا رہا ہے اور لاکھوں آدمی اسے پڑھ چکے ہیں۔ اِس قانون کے ماتحت اس کی ضبطی پر ہر شخص خود رائے قائم کر سکتا ہے کہ ہماری حکومت کے ذہن میں ڈیفنس اوف پاکستان کا تصور کیا ہے۔ غالباً اب یہ نیا تصور قائم کیا گیا

> ہے کہ جو چیز بھی حکومت کی مرضی کے خلاف ہو اس سے پاکستان کے دفاع کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ شاید بنیادی حقوق اسی لئے بحال نہیں کئے جا رہے کہ اس طرح کی من مانی کارروائیوں کے متعلق کوئی عدالت اس بات کا فیصلہ نہ کر سکے کہ ان میں قانون کا صحیح استعمال ہوا ہے یا نہیں۔
>
> (بحوالہ ہفت روزہ "آئین" لاہور۔ مورخہ ۱۵ اگست ۶۶ء)

یہ بیان اور اس پر حاشیہ آرائیاں ملک میں عام کی جا رہی ہیں اور حکومت کی مشینری خاموش کھڑی تماشہ دیکھ رہی ہے اور ایک لفظ زبان سے نہیں کہتی، کہ اس کتابچہ سے ملک کو کون سا خطرہ لاحق ہو رہا تھا۔

اس حقیقت کے متعلق اب کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ جماعت اسلامی کو (جو درحقیقت دوسرا نام ہے شخص واحد ـــ سید ابوالاعلےٰ مودودی کا) نہ دین سے کوئی واسطہ ہے نہ شریعت سے کوئی تعلق ـــ یہ سب وہ ڈھالیں ہیں جن کے پیچھے ان کی ہوسِ اقتدار پناہیں لیتی ہے۔ یہ جماعت، تحریکِ پاکستان کی مخالفت کے لئے ۱۹۴۱ء میں وجود میں لائی گئی۔ اس تحریک کی اس نے جی بھر کر مخالفت کی، لیکن جب اس کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ ہی گیا، تو یہ حضرات پاکستان پہنچ گئے اور کامل انیس سال سے اس "جہادِ عظیم" میں مصروف ہیں کہ ـــ یا تو زمامِ اقتدار ہمارے ہاتھ میں دے دو، ورنہ ہم ملک میں ایسا انتشار پیدا کرتے رہیں گے جس سے یہ مملکت ایک دن کے لئے بھی چین سے نہ بیٹھ سکے گی۔ مذہب پرست قوم میں، انتشار پھیلانے کے لئے، مذہب سب سے بڑا مؤثر حربہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس حربہ کو یہ مسلسل کام میں لاتے رہتے ہیں۔ جہاں تک، ان کی شریعت کا سوال ہے، اس کی رُو سے ایک ہی چیز ایک وقت حرام قرار پاتی ہے اور دوسرے وقت وہ عین مطابقِ شریعت ٹھہر جاتی ہے (طلوع اسلام میں اس کی بہت سی مثالیں اس سے پہلے دی جا چکی ہیں۔ اس لئے اس وقت ان کی تکرار کی ضرورت نہیں) ان کا بنیادی معیار اس سلسلہ میں یہ ہے کہ حکومت کے ہر اقدام کو خلافِ شریعت قرار دے کر اس کے خلاف نفرت پھیلائی جائے ـــ "بایں فسانہ مگر عمرِ خود دراز کنم" ـــ جب سے حکومت نے خاندانی منصوبہ بندی پر زور دیا ہے، ان کی طرف سے اسے حرام قرار دیئے جانے کی مہم تیز کر دی گئی ہے۔ اس کے پیچھے جذبہ محرکہ کیا ہے؟ اسے غور سے سنیئے!

اس وقت خوراک کے مسئلہ نے دنیا میں جو اہمیت اختیار کر رکھی ہے اس سے ہر صاحب ہوش

واقف ہے۔ سابقہ زمانوں میں، نظامِ معاشرہ بالعموم اس قسم کا ہوتا تھا جس میں، یہ ذمہ داری افراد کی اپنی اپنی تھی کہ وہ اپنے، اور اپنے اہل و عیال کے لئے، خوراک کس طرح پیدا یا مہیا کرتے ہیں۔ مملکت کو اس سے واسطہ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ ذمہ داری مملکت کی قرار پاجاتی ہے کہ وہ ملک کے لئے بہ حیثیت مجموعی خوراک پیدا یا مہیا کرے۔ اس مقصد کے لئے مملکت کو تین عناصر سامنے رکھنے پڑتے ہیں۔

۱۔ مملکت کی موجودہ آبادی اور آبادی کے بڑھنے کی رفتار۔

۲۔ مملکت کی موجودہ پیداوار اور پیداوار بڑھانے کی تدابیر۔

۳۔ عندالضرورت، دوسرے ممالک سے خوراک حاصل کرنے کے امکانات۔

یہ عناصر دنیا کی ہر مملکت کے سامنے ہیں، بالخصوص اس لئے کہ جس تیزی سے آبادی بڑھ رہی ہے اس تیزی سے پیداوار بڑھانے کے امکانات یقینی طور پر کہیں بھی نہیں۔ (حتیٰ کہ امریکہ جس کی طرف آج کل دنیا کے ہر حاجت مند ملک کی آنکھیں اُٹھ رہی ہیں، خود اس مشکل کا حل سوچ رہا ہے۔ پچھلے سال، اس کی گندم کی پیداوار، سالہائے گذشتہ کی نسبت کم ہوئی ہے، اور آبادی وہاں بھی بڑھ رہی ہے۔)

پاکستان کا اس وقت، دنیا کے ان ملکوں میں شمار ہوتا ہے جہاں آبادی گنجان ترین ہے۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری کی رُو سے، اس کی آبادی ۲۵۶ فی مربع میل تھی جبکہ ایشیا کی بہ حیثیتِ مجموعی آبادی ۱۲۳ فی مربع میل تھی۔ اسی طرح، یہاں کی آبادی کے اضافہ کی رفتار (۲/۱۶) تھی جبکہ سارے ایشیا کی اوسط رفتار (۲) تھی۔ یہ تو ہے اس کی آبادی کی حالت۔ جہاں تک پیداوار کا تعلق ہے، ملک کی مسلسل کوشش کے باوجود، یہ ابھی تک خودکفیل نہیں ہو سکا۔ اور اگر اس کی آبادی اسی نسبت سے بڑھتی رہی تو یہ خودکفیل ہو نہیں سکے گا۔ آبادی کے اسی اضافہ کی وجہ سے اسے دوسروں سے اناج مانگنا پڑتا ہے۔ اور اس کے لئے پھر جس قدر دوسروں کا محتاج ہونا پڑتا ہے، وہ ظاہر ہے۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر، یہاں نہ صرف اناج ہی کے مسئلہ کا (نہیں، بلکہ اہم سیاسی مسائل کا بھی) حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ (۱) اناج کی پیداوار بڑھانے، اور (۲) آبادی کو ایک حد کے اندر رکھنے کی تدابیر پر شدت سے عمل کیا جائے۔ اس دوسری تدبیر کا نام ہے — خاندانی منصوبہ بندی — یعنی لوگوں سے یہ کہنا کہ تم اتنی اولاد پیدا کرو جتنے کے تم (انفرادی طور پر اور بہ حیثیت مجموعی) متحمل ہو سکو۔ جماعتِ اسلامی اسی کی مخالفت کر رہی ہے۔

اس مقام پر آپ ایک ثانیہ کے لئے رک جائیے اور سوچئے کہ اگر ایک شخص کے ہاں چار پانچ بچے موجود ہوں اور وہ دیکھے کہ اس کی آمدنی اس سے زیادہ بچوں کی پرورش کی کفیل نہیں ہو سکتی اور وہ فیصلہ کر لے کہ مجھے اور بچے پیدا نہیں کرنے چاہئیں ـــ تو (آپ سوچئے کہ) کیا اس کا یہ فیصلہ کسی صورت میں بھی اسلام کے خلاف قرار پا سکتا ہے؟ [1]

کہا یہ جاتا ہے کہ اس کے لئے جو مانع حمل ادویات یا آلات تجویز کئے جاتے ہیں، ان سے حرامکاری پھیلنے کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ لوگ ان ذرائع کو ناجائز مقاصد کے لئے استعمال کریں گے، اس لئے جائز مقاصد کے لئے ان کے استعمال کی اجازت نہ دی جائے۔ اس دلیل کو آگے بڑھائیے تو بات یوں ہو گی کہ چونکہ لوگ دوسروں کے پیٹ میں چاقو گھونپ کر انہیں قتل کر دیتے ہیں، اس لئے چاقو بنانا اور رکھنا قانوناً جرم قرار دے دیا جائے۔ چونکہ لوگ خواب آور گولیوں سے خودکشی کر لیتے ہیں، اس لئے ان ادویات کی درآمد اور ساخت قانوناً روک دی جائے۔ چونکہ لوگ دریاؤں میں ڈوب کر مر جاتے ہیں، اس لئے ان کا پانی بھارت کی طرف منتقل کر کے انہیں خشک کر دینا چاہیئے۔ وقس علیٰ ھذا! یعنی بجائے اس کے کہ یہ کہا جائے کہ ان ذرائع کو غلط مقاصد کے لئے استعمال نہیں ہونے دینا چاہیئے، سرے سے خاندانی منصوبہ بندی ہی کو ناجائز قرار دیدیا جائے!

اگر خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف یہ مہم اس لئے جاری کی جا رہی ہے کہ اس سے حرامکاری کے امکانات زیادہ ہو جائیں گے، تو سوال یہ ہے کہ ملک میں حرامکاری اور بہت سے طریقوں سے بھی پھیل رہی ہے۔ کیا جماعت اسلامی نے اس کے خلاف بھی کبھی کوئی مہم جاری کی ہے؟ ابھی کل تک ملک میں، زنا کے اڈے ہر جگہ کھلے بندوں ملتے تھے (اور اب بھی وہ معدوم نہیں ہو گئے)۔ کیا آپ نے کبھی سنا تھا کہ جماعتِ اسلامی نے ان اڈوں کو بند کرنے کے لئے کوئی مہم اس طرح چلائی ہو؟

---

[1] قرآن کریم کی رُو سے اس کی پوزیشن کیا ہے، اس کے متعلق طلوعِ اسلام کے صفحات میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حیوانات اور انسان میں ایک خطِ امتیاز یہ بھی ہے کہ حیوانات، فطرت کے تحرکات کی رُو سے اپنے وقت پر اولاد پیدا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور انسان کو اس باب میں صاحبِ اختیار رکھا گیا ہے کہ وہ اپنے حالات کے پیشِ نظر، اپنے پلان کے مطابق اولاد کو محدود کرے۔ ہمارے نزدیک اس کیلئے بہترین طریقہ ضبطِ خویش ہے۔

کیا جماعت اسلامی یا مودودی صاحب نے کوئی ایسا کتابچہ شائع کیا جسے نفس زنا کے خلاف مختص طور پر لکھا، اور ملک گیر مہم کے طور پر شائع کیا گیا ہو؟ اندریں حالات کیا یہ حقیقت' انسان کو یہ سوچنے پر مجبور نہیں کر دیتی کہ ان لوگوں کی طرف سے زنا کے خلاف تو آج تک کبھی کوئی مہم چلائی نہیں گئی، اور خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف اس لئے مہم چلائی جا رہی ہے کہ اس سے زنا کے زیادہ ہو جانے کے امکانات ہیں۔ بالآخر یہ کیوں ہے؟ ملک میں زنا کو عام دیکھ کر تو ان کے دل میں شریعت کے تحفظ کا درد کبھی نہیں اٹھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف ان کے سینے میں یہ درد اس کرب انگیز انداز سے کیوں اُبھرا ہے! بالآخر اس کی کوئی تو وجہ ہے؟

اور وہ وجہ ظاہر ہے۔ اگر ملک میں آبادی کی رفتار کی تحدید نہ کی گئی تو اس سے حسبِ ذیل نتائج یقیناً پیدا ہوں گے۔

(۱) خوراک کی کمی کی وجہ سے ملک میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ آجکل ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے؟ خوراک کی کمی کی وجہ سے سارے ملک میں بغاوت پھیل رہی ہے۔

(۲) اس صورتِ حالات سے نپٹنے کے لئے پاکستان کو ہمیشہ ان ممالک کا محتاج رہنا پڑے گا جن سے اسے غلہ مل سکتا ہو۔

یہ ہے وہ "شریعت حقہ" جس کے تحفظ کے لئے جماعت اسلامی کی طرف سے، خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف اس شد و مد سے مہم چلائی جا رہی ہے۔ اس مہم کی شدت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ، جماعت اسلامی کے ایک ترجمان' ــــ ہفت روزہ آئین' کے (مورخہ ۱۵ ۸) کے بیان کے مطابق، حکومت نے "جماعت اسلامی لاہور کے دفتر واقع ہال روڈ سے کل رات ۴۰ ہزار کتابچے اپنے قبضے میں کر لئے ہیں۔ علاوہ ازیں آج سرگودہا، لائلپور، اور ملتان سے بھی یہ اطلاعات موصول ہوتی ہیں کہ پولیس جماعت اسلامی کے دفاتر سے اس کتابچے کے تمام نسخے اٹھا لے گئی ہے"۔ جماعت اسلامی کی شاخیں ملک بھر میں ہیں۔ جب ایک شاخ (لاہور) کے دفتر سے ۴۰ ہزار کتابچے سٹاک سے ملے ہیں تو اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ تمام ملک کے لئے اس کتابچے کی کاپیاں کس قدر شائع ہوئی ہوں گی۔ اور اس پر کیا خرچ آیا ہو گا ــــ پھر اسے بھی ذہن میں رکھئے کہ "یہ مضمون کئی سال سے شائع ہوتا رہا ہے"۔

اور یہ تو صرف ایک کتابچے کی روئیداد ہے۔ ان تمام برسوں میں' اس جماعت کی طرف سے اس مہم کے خلاف' جو ملک گیر پراپیگنڈہ کیا گیا ہے اور اس پر جس قدر خرچ آیا ہو گا۔ اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ اس سے فطرۃً یہ سوال اُبھرتا ہے کہ کیا اس تمام قیامت خیزی کا جذبۂ محرکہ "اقامتِ دین"

ہے ـــــ یا

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں ؟

دوسری طرف حکومت کی مشینری کو لیجئے۔ اس کے اس اقدام سے ظاہر ہے کہ اس کے نزدیک جماعت اسلامی کی یہ مہم ملک کے لئے باعثِ خطرہ تھی۔ اس جماعت کے بیانات کے مطابق " یہ مضمون کئی سال سے شائع ہوتا رہا ہے "، اور " اسے لاکھوں آدمی پڑھ چکے ہیں " ـــــ یعنی برسوں سے یہ زہر ملک میں پھیلایا جا رہا تھا۔ اور حکومت اپنا دیدۂ بینا وا کئے، خاموش اس تماشا کو دیکھ رہی تھی۔ جب یہ زہر اچھی طرح پھیل چکا تو پھر یکایک اس کی مشینری میں حرکت پیدا ہوئی اور اس نے جا کر زہر کی خالی شیشیوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ہم اربابِ حکومت سے باادب دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا ملک کو اس قسم کے زہر سے محفوظ رکھنے کا یہی طریق ہوتا ہے ؟

اور پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ جماعت اسلامی شور مچا رہی ہے کہ یہ آبِ زمزم کی شیشیاں تھیں جن سے ملک اتنے عرصے سے فیضیاب ہو رہا تھا اور اب انہیں حکومت نے جبراً ضبط کر لیا ہے اور حکومت کی طرف سے عوام کو قطعاً نہیں بتایا جاتا کہ یہ زمزم کا مقدس پانی نہیں تھا، زہر ہلاہل تھا جو ملت کے سرچشمۂ حیات میں ملایا جا رہا تھا۔

غور کیجئے، وہ " اللہ والوں " کی جماعت ہے جو دین کے درد کا بہانہ لئے ہوئے اس خطۂ زمین کو یوں گروا ہرمن بنانے کے لئے اس قسم کی حرکات میں مصروف ہے اور یہ ملک کی محافظت کی مشینری ہے، جو خطرات کی روک تھام کے لئے اس وقت اٹھتی ہے جب خطرات اپنا پورا کام کر چکتے ہیں۔

ہم اربابِ حکومت سے عرض کریں گے کہ وہ ملک کو بیرونی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لئے اتنا کچھ سوچ اور کر رہے ہیں، تو اس اندرونی خطرہ کی شدت کا صحیح اندازہ اور اس کی روک تھام کے لئے مؤثر اقدامات کیوں نہیں کرتے ؟ ہماری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ہم بیرونی خطرات سے کبھی تباہ نہیں ہوتے۔ ہمیں ہمیشہ اندرونی خطرات نے تباہ کیا ہے۔

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ؟

استفسارات

یہ ضروری نہیں کہ ہر استفسار کا جواب طلوع اسلام میں شائع ہو۔ جواب نجی طور پر بھی دیا جا سکتا ہے۔ مستفسر کے لئے ضروری ہے کہ اپنا پورا پتہ لکھیں

۶ر ستمبر کے یاد میں

ایک انقلاب آفریں رات

سال گذشتہ، جنگ کے دوران اور اس سے کچھ دنوں بعد تک، ریڈیو پاکستان لاہور سے "شہر کے لوگ" کے عنوان سے ایک سلسلۂ تقاریر نشر کیا گیا تھا۔ اس میں ایک تقریر پرویز صاحب نے بھی کی تھی، جسے ملک میں بے حد پسند کیا گیا۔ ہم جنگ کی اس سالگرہ کی تقریب پر، اس تقریر کو دوبارہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں کہ ہمارے نزدیک اس عظیم واقعہ کی یادگار اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ (طلوع اسلام)

برادرانِ عزیز ! سلامت و رحمت !

جب سے سورج نے اپنی آنکھ کھولی ہے زمین پر سلسلۂ روز و شب جاری ہے۔ عام حالات میں رات اور دن کی اس گردشِ لامتناہی کی کیفیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی کہ ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

لیکن صبح و شام کے اس بے حرکت و بے رنگ سلسلہ میں، بعض ایام ایسے بھی آجاتے ہیں جنہیں خدا نے ایام اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی خدا کے اپنے دن۔ یہ "خدا کے اپنے دن" وہ ہیں جن میں حق و باطل کا کوئی فیصلہ کن معرکہ رونما ہوا ہو۔ گذشتہ ستمبر کے سترہ دن ہمارے ہاں بھی ایسے آئے جنہیں بجا طور پر "ایام اللہ" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ ان میں حق و باطل کا وہ قیامت خیز معرکہ رونما ہوا جس نے پاکستان کی تاریخ ہی کے نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ کے صفحات پر اپنا نقشِ دوام اس طرح ثبت کر دیا ہے کہ گردشِ لیل و نہار کا کوئی حادثہ اسے محو نہیں کر سکتا۔ اس معرکہ میں ہم نے کیا کچھ حاصل کیا۔ اس کی تفاصیل کا بیشتر حصہ اس وقت تک آپ کے

سامنے آچکا ہے۔ اور باقی ماندہ آہستہ آہستہ سامنے آتا رہے گا۔ دشمن کا سینکڑوں میل پر مشتمل رقبہ ہمارے قبضہ میں ہے۔ ہم نے اس کے لاتعداد ٹینک تباہ کر دیئے اور متعدد صحیح و سالم ہماری گرفت میں ہیں۔ ہم نے اس کے سینکڑوں طیاروں کے پَر نوچ ڈالے اور بیسیوں ہمارے ہاں پابندِ قفس ہیں۔ اس کے بے شمار قیدی محبوس ہوئے اور بے حد و نہایت اسلحہ اور دیگر سامانِ جنگ ہمیں بطور غنیمت ملا۔ یہ سب فتوحات بڑی قیمتی ہیں جن پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ لیکن ان سب سے زیادہ بیش قیمت متاع ایک اور ہے، جو ہمیں اس جنگ سے حاصل ہوئی۔ وہ متاعِ بے بہا یہ ہے کہ "ہم نے خود اپنے آپ کو پا لیا"۔ صدیوں سے ہماری قوم اپنی نگاہوں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اُسے اپنے آپ کا علم ہی نہ تھا۔ اُسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اُس کے اندر کس قدر ممکناتِ زندگی مضمر ہیں۔ اُسے احساس تک نہیں تھا کہ وہ کیسی محیر العقول خصوصیات کی حامل ہے۔ وہ کیا کچھ کر سکتی ہے، اُسے اس کا مطلقاً اندازہ نہیں تھا۔ ہم پانچ ستمبر کی شام کو سوئے تو اسی قوم کے افراد تھے لیکن جب ۶ ستمبر کی صبح کو بیدار ہوئے تو وہ کوئی اور ہی قوم تھی۔ ریاضؔ خیرآبادی نے کہا تھا کہ ؎

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور
نکلے جو میکدہ سے تو دُنیا بدل گئی!

۶ ستمبر کی صبح دشمن کی توپوں کی گرج نے جو فضا کے پردے چاک کئے ہیں تو ہمارے سامنے ایک اور ہی دنیا تھی۔ ۱۷ دن کے قیامت خیز ہنگاموں میں ہمیں اپنے آپ کی تھوڑی سی جھلک دکھائی دی تھی لیکن اُس کے بعد ہم اپنی نگاہوں سے یکسر اوجھل ہو گئے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دنیا کی کوئی خرابی ایسی نہیں تھی جو ہمیں اپنے اندر دکھائی نہ دیتی ہو۔ اِس میں شبہ نہیں ہم میں بعض خرابیاں فی الواقعہ موجود تھیں۔ لیکن ایک مسلسل پراپیگنڈے نے ہمارے اندر ایسا احساسِ کہتری پیدا کر دیا کہ ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم دنیا کی ناکارہ ترین قوم ہیں، ہم میں کوئی خوبی ہی نہیں۔ ہم کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ رفتہ رفتہ ہمیں اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ ہمیں پاکستانی کہلاتے ہوئے شرم محسوس ہونے لگی۔

اس احساسِ کہتری کو دور کرنے کے لئے قرآنِ کریم کی راہ نمائی ہمارے سامنے تھی۔ وہ ہمیں جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا کہ ــــ وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (۳/۱۳۹) تم گھبراتے کیوں ہو، تم افسردہ خاطر کیوں ہوتے ہو۔ اگر تم قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقینِ محکم رکھ کر خود اعتمادی پیدا کر لو، تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔" وہ ہم سے بار بار کہتا تھا، کہ تم اپنی تعداد کی کمی سے مت گھبراؤ۔ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا

مَا ئَتَيْنِ ــــ (۶۵) اگر تم میں بیس ثابت قدم مجاہد ہوتے تو وہ دشمن کے دو سو سپاہیوں پر غالب آ جائیں گے، ہم ان آیات کو پڑھتے اور ان کی تلاوت کا ثواب حاصل کر کے قرآن کو پھر بالائے طاق رکھ دیتے تاریخ میں ہمارے سامنے ہمارے اسلاف کے وہ محیر العقول کارنامے آتے، جنہیں ہمارے لئے نمونہ بننا تھا۔ ہم ان کارناموں کو پڑھتے تو اپنی بے عملی اور دوں ہمتی کو اس خود فریبی کے پردے میں چھپا کر آگے بڑھ جاتے کہ یہ سب کچھ معجزات اور کرامات کی رُو سے ہُوا تھا۔ اب وہ معجزے کس سے سرزد ہو سکتے ہیں؟

ہمارا حکیم الامت ہم سے بار بار کہتا کہ ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے

لیکن ہم اسے ایک شاعر کا سہانا خواب کہہ کر حوالۂ طاؤس و رُباب کر دیتے۔ یہ کچھ ہوتا رہا اور ہم بدستور سوتے رہے۔ لیکن ۶ ستمبر کی صبح توپوں کے ایک ہی دھماکے نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ اور قوم کے تحت الشعور میں خوابیدہ قوتیں اسطرح اُبھر کر سامنے آگئیں جس طرح بربط کے خاموش تاروں میں چھپے ہوئے نغمے، مضراب کی ایک ضرب سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ ہم نے اپنے ثریا شکار طیاروں کے جاں فروش شاہیں بچوں کو دیکھا تو وہ اس حقیقت کی عملی تفسیر تھے۔ کہ ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

ہم نے اپنی بری اور بحری فوجوں کے جانبازوں پر نگاہ ڈالی تو اُن کا جوشِ عمل پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ ؎

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی!
اب بھی درختِ طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

ہم نے اپنی قوم کی طرف دیکھا تو وہ ہمت، استقامت، عزم، ایثار، بلند حوصلگی، کشادہ نگہی، خود فراموشی اور اقدار پرستی کی چلتی پھرتی تصویر تھی۔ قوم کیا تھی، ایک ٹیم تھی جس کے ہر کھلاڑی کے سامنے ایک ہی مقصد تھا۔ یعنی اپنی ٹیم کی کامیابی اور فریقِ مقابل کی شکست۔ آسمان کی آنکھ اُس قوم کو دیکھ کر ششدر و حیران تھی۔ اور اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی قوم ہے جسے اس نے گزشتہ شب

کی تاریکی میں لپیٹ کر سلایا تھا۔

یہ ہے برادرانِ عزیز! وہ متاعِ بے بہا جو ہمیں اس معرکۂ حق و باطل سے حاصل ہوتی ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو پالیا ہے۔ قرآن کریم نے کہا تھا۔ — وَفِىٓ اَنفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔ (۵۱/۲۱)۔ تم معجزات اور کرامات کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو، تم خود اپنے اندر جھانک کر دیکھو، اس میں تمہیں ایسی ایسی محیر العقول قوتیں نظر آئیں گی جن کا تم قیاس و گمان بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے اپنے اندر جھانک کر دیکھا تو فی الواقعہ وہاں ان قوتوں کا بے بہا ذخیرہ تھا ان سے ہمیں اس حقیقت کا اندازہ ہوا کہ ہمارے اسلاف سے معجزانہ کارنامے سرزد ہوئے تھے وہ ان کے ذوقِ یقین اور جوششِ کردار کے مظاہرے تھے۔ وہی معجزے ہم سے بھی سرزد ہو سکتے ہیں بشرطیکہ ہمیں بھی اپنے مقصد کی صداقت پر یقینِ محکم حاصل ہو، اور اس مقصد کے حصول کے لئے جذبۂ عمل بیدار۔ اس سے وہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آگئی جسے علامہ اقبال نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ —

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

سوال یہ ہے کہ ان بے پناہ قوتوں کو جو ہم میں ہنگامی طور پر بیدار ہوئی ہیں، مستقل متاعِ حیات کیسے بنایا جائے۔ ہمارے مستقبل کا دار و مدار اسی سوال کے اطمینان بخش جواب پر ہے، اور یہ جواب قرآن کے علاوہ اور کہاں سے مل سکتا ہے؟

والسلام!

(بشکریہ ریڈیو پاکستان)

طلوعِ اسلام کے انقلابی لٹریچر

کے لئے فہرست کتب مفت طلب فرمائیں۔ رسالہ میں جو کارڈ منسلک کیا جاتا ہے اسکے مطابق فرمائش بھیجتے وقت کارڈ پر چھپی ہوئی ہدایات ضرور دیکھ لیں۔ پیشگی خریداروں کے زمرے میں داخل ہو جانے سے آپکو ڈاک کے خرچ کی بچت ہو جائے گی۔

تو اگر بھول گیا ہو تو بتا دوں تجھ کو

۱۴۔ اگست۔ یوم آزادی کی تقریب پر ملک کے راہنماؤں میں سے ہر ایک نے یہ کہا کہ ہمیں قائداعظم کے ان ارشادات کو یاد رکھنا چاہیئے جو انہوں نے حصولِ پاکستان کے سلسلہ میں فرمائے تھے۔ قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس (اپریل ۱۹۴۳ء) کے خطبہ صدارت میں فرمایا تھا۔

Here I should like to give a warning to the landlords and capitalists who have flourished at our expense by a system which is so vicious, which is so wicked and which makes them so selfish that it is difficult to reason with them. (Tremendous applause.) The exploitation of the masses has gone into their blood. They have forgotten the lessons of Islam. Greed and selfishness have made these people subordinate to the interests of others in order to fatten themselves. It is true we are not in power today. You go anywhere to the country-side. I have visited villages. There are millions and millions of our people who hardly get one meal a day. Is this civilisation? Is this the aim of Pakistan? (Cries of no, no.) Do you visualise that millions have been exploited and cannot get one meal a day! If that is the idea of Pakistan I would not have it. (Cheers.) If they are wise they will have to adjust themselves to the new modern conditions of life. If they don't, God help them; We shall not help them. (Hear, hear, renewed cheers and applause.)

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں، وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے جو انسان کو بیدمست کر دیتا ہے، کہ وہ کسی معقول بات کو سننے کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ وہاں میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصد ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ، ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔

دین کی باتیں

پرویز صاحب کے درسِ قرآن کریم کے اہم نکات۔ مرتبہ:۔ محترمہ ثریا عندلیب

۲۹۔ وہی انسانی علم علم کہلانے کا مستحق ہے جس میں انسان اپنے حواس سے پورا پورا کام لے اور فکری طور پر استنباطِ نتائج کرے۔

۳۰۔ قرآن کریم کے مطابق فیصلے نہ کرنے کی وجہ سے انسانی معاشرہ دولت اور رزق کی فراوانی کے باوجود جہنم بن جاتا ہے۔

۳۱۔ جو قوم جس سانس میں جد وجہد (جہاد) سے جی چراتی ہے، اسی سانس میں اس پر موت طاری ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ موت درحقیقت نام ہی ترکِ جہاد کا ہے۔

(۳۲)۔ جو شخص دوسروں کو مال و دولت سے محروم رکھتا ہے، وہ درحقیقت اپنی ذات کو سعادتوں اور کامرانیوں سے محروم رکھتا ہے۔

۳۳۔ تم سے ہر متاع کے متعلق پوچھا جائے گا کہ وہ کیسے حاصل کی گئی تھی اور کہاں صرف ہوتی تھی۔

(۳۴)۔ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص قرآن کی روشنی میں خالی الذہن ہو کر غور و فکر کرے اور صحیح راستہ اسکے سامنے نہ آئے۔

۳۵۔ ایک آئینِ خداوندی کی پابندی، ہزاروں انسانوں کی غلامی سے چھڑا دیتی ہے لیکن آئین کی پابندی بہ طیبِ خاطر ہونی چاہیئے۔

۳۶۔ قرآن کا مقصد اختلافات کو مٹا کر، دین کی وحدت کا قیام ہے اور اختلافات کا مٹ جانا خدا کی رحمت ہے۔

۳۷۔ اے جماعتِ مومنین! تم ہمیشہ استقامت سے کام لو۔ نہ صرف یہ کہ فرداً فرداً استقامت دکھاؤ، بلکہ ایک دوسرے کی استقامت کا ذریعہ بن جاؤ۔

۳۸۔ جس نے کسی ایک جان کو بھی ناحق قتل کر دیا، اس نے گویا تمام نوعِ انسانی کو قتل کر دیا۔ اور جس نے کسی ایک جان کے لئے سامانِ زندگی بہم پہنچایا اس نے گویا تمام نوعِ انسان کو زندگی بخش دی۔

لغات القرآن کیا ہے؟

لغات القرآن کا نام سامنے آنے سے ذہن میں کچھ اس قسم کا خیال آتا ہے کہ یہ قرآنی الفاظ کی ڈکشنری ہے جس میں اس طرح معنے دیئے گئے ہیں۔ مثلاً

حمد = تعریف

لغات القرآن اس طرح کی ڈکشنری نہیں۔ اس میں قرآنی الفاظ کے معنی ہی نہیں دیئے گئے، بلکہ وہ تصورات (CONCEPTS) دیئے گئے ہیں جو ان الفاظ کے ذریعے قرآن پیش کرتا ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہے کہ (مثلاً) اسی لفظ (حمد) کی تشریح قریب اڑھائی صفحات میں دی گئی ہے۔ (رب) کے لفظ کی تشریح تین صفحات سے زائد میں آئی ہے۔ (الٰہ) کی وضاحت دو صفحات میں ہے۔ لفظ (حرام) کی تشریح ساڑھے تیرہ صفحات میں، اور (صلوٰۃ) بارہ صفحات میں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس کا نتیجہ ہے کہ جن حضرات نے اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ اس کے مؤلف (پرویز صاحب) کی علمی وسعت اور برسہا برس کی محنت شاقہ پر محو حیرت رہ جاتے ہیں۔ اور ان کی رائے یہ ہے کہ اگر اس لغات کو سامنے رکھ کر قرآن کریم کا مطالعہ کیا جائے تو کسی تفسیر کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ ارباب فکر و نظر اسے مشکل الفاظ کے معانی دیکھنے کے لئے، ڈکشنری کی طرح (CONSULT) نہیں کرتے اس کا تفسیر کی طرح مطالعہ کرتے ہیں۔ اس وضاحت کا نتیجہ ہے کہ یہ لغت، طباعت کی نہایت خوبصورت طباعت میں، چار ضخیم جلدوں (کے قریب ساڑھے اٹھارہ سو صفحات) پر پھیلی ہوئی ہے۔

پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپیہ فی جلد اور چوتھی جلد کی قیمت بارہ روپے ہے۔ مکمل سیٹ -/۵۷ روپے کے بجائے -/۵۰ روپے میں دے دیا جاتا ہے۔ اگر آپ قرآن کریم کو صحیح معنوں میں سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے اس لغات سے بہتر کوئی اور معاون آپ کو نہیں ملے گا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام - ۲۵ بی گلبرگ - لاہور

بچوں کا صفحہ

ایک طاہرہ بیٹی کا خط

بابا جیؒ!

اپنی طاہرہ بیٹی کا سلام اور مبارک قبول کریں!

میں نے امسال بورڈ کا مڈل سکول امتحان دیا تھا۔ میں نے ۷۰۱ نمبر حاصل کئے ہیں اور مڈل سکول سکالرشپ حاصل کیا ہے۔ دوسری خوشخبری بھی سنیئے۔ آپکی دوسری بیٹی رعنا ضیاء نے پانچویں کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کر کے مڈل سکول سکالرشپ جیت لیا ہے۔

کچھ عرصہ پیشتر میں نے بذریعہ ابا جان آپسے وعدہ کیا تھا کہ میں کالج فنڈ کیلئے اپنے وظیفہ کی پوری رقم (بیچ بیس روپے انعام کے جو ابا جان سے مجھے ملا تھا) دونگی۔ مجھے ابھی تک وظیفہ کے صرف ۱۲ روپے ملے ہیں۔ باقی رقم رکی ہوتی ہے۔ کیونکہ پہلے میں پنڈی ریجن میں تھی اور اب لاہور ریجن میں ہونے کی وجہ سے دیر ہو گئی ہے۔ رعنا بہن بھی کہہ رہی ہے کہ میں بھی اپنے وظیفہ کی رقم کالج فنڈ کیلئے دینے کا وعدہ کرتی ہوں۔ ہمیں اس کالج کی بڑی ضرورت ہے۔ تاکہ ہم اپنے کالج میں قرآن حکیم کی صحیح تعلیم حاصل کر سکیں۔ سکول میں جو ہمیں مذہبی تعلیم دیجاتی ہے وہ گھر کی تعلیم سے مختلف ہوتی ہے۔

بابا جی! گزشتہ سال آپ نے مجھے اسلامی معاشرت کا جو نسخہ بھیجا تھا وہ میں ہر روز ابا جان سے سبقاً سبقاً پڑھتی ہیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں اپنی پوری زندگی قرآن کے ان اصولوں کیمطابق بسر کرنے کی کوشش کروں گی۔

آپ کی بیٹی

"تبسم ضیاء" (ازڈسکہ)

میری عزیز بچیو! جیتی رہو! اللہ تمہیں زندگی کے ہر بلند مقصد میں اسیطرح قابل رشک طریق پر کامیاب کرے۔ قوم کی توقعات تمہارے ہی جیسی بلند اختر بچیوں کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور مستحق صد مبارکباد ہیں وہ گھرانے جن کی تربیت سے ایسی بچیاں پروان چڑھ رہی ہیں۔

بہت بہت دعاؤں کے ساتھ

تمہارا "بابا جی"

خورشید عالم

بھارت کا عالمی کردار

کسی قوم کے عالمی کردار کا مطالعہ کرنے کے لئے اس کے تاریخی پس منظر کا جاننا ضروری ہے جس سے اس کا مزاج تشکیل پذیر ہوتا ہے۔ اس بدیہی اصولِ مطالعہ کا اطلاق اس اجتماعِ انسانی پر آسان نہیں جو آج کل ہندو کہلاتا ہے۔ اس میں مشکل اذدشکل ہے۔ اس قوم کی نہ کوئی تاریخ ہے، نہ یہ کبھی ایک قوم رہی اور نہ اب ہے۔ 'ہندو' تاریخِ عالم کا ایک عجیب و غریب معمہ ہے۔ اس معمہ کی عقدہ کشائی آج تک کوئی نہیں کر سکا، یعنی یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ ہندو قوم کیا ہے، اور کیوں یہ ایک قوم ہے یا ایک قوم کہلاتی ہے۔ ہندو کہلانے والے بڑے بڑے پنڈتوں نے بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ ان کے اہلِ علم اور اہل الرائے دور دور کی کوڑی لاتے ہیں۔ ان کے مہاتماؤں نے جن کی بغل میں سیاست تھی اور منہ میں رام تھا، بہت سر پٹکا لیکن کسی ایک کا ناخن، بلکہ ان سب کے لمبے اور نوکیلے ناخن مل کر بھی یہ گرہ کھول کر نہ بتا نہیں سکے کہ ہندو کون ہیں اور ان کے معتقدات کیا ہیں۔ بہت سے غیر ہندو اہلِ قلم اور اصحابِ نظر اس علمی بن کے باسی بنے۔ ان کے ذہن اور قلم نے اس جنگل کی پیچ در پیچ شاخوں میں قلابازیاں کھائیں۔ انہیں بھی بالآخر اعترافِ عجز اور شکست کرنا پڑا۔ کوئی بھی نہ سمجھ سکا، نہ بتا سکا کہ ہندو کیا ہیں۔

ہندو کی تعریف کی بھول بھلیوں میں کھو جانے سے بہتر ہے کہ یہ دیکھ لیا جائے کہ ہندو کہلانے والے ہندو کیسے کہلائے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ لفظ ہندو سندھو (دریا) کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ سندھو وہ تاریخ ساز دریا ہے جس کا ارتقائے انسانی میں نمایاں ہاتھ ہے۔ تحقیقات کا رُخ اب اس طرف ہوتا جا رہا ہے کہ اس کے کنارے تہذیبِ انسانی کا ہی گہوارہ نہیں، بلکہ انسان کا مسکنِ اول بھی ہیں۔ اس دریا کا نام سندھو ہوا کرتا تھا اور اس وادی کو سپت سندھو کہا جاتا تھا کیونکہ اسے سیراب کرنے والے سندھو اور اس کے چھ معاون یعنی کل سات دریا ہوا کرتے تھے۔ سندھو چینیوں کے ہاں شن تو، یوان تو، ادین تو

بنا اور اہل فارس کے ہاں ہندو --- یہی نام ایران کے راستے یونان پہنچا تو انڈو بن گیا۔ سکندر یونانی سے پہلے وادیِ سندھ پر ایران کی حکومت تھی۔ ایرانی اس علاقے کو سندھ کی مناسبت سے ہند کہتے تھے اور یہاں کے رہنے والوں کو ہندو۔ ان کے نزدیک ہندو سے مراد نہ کوئی مذہب تھا، نہ کوئی قوم تھی۔ وہ اس سے مراد لیتے اہل ہند --- اہل فارس اسی ہند پر حکمران رہے اور اسی ہند کو یونانیوں نے فتح کیا تاریخ اس ہند کو جانتی ہے اور یہی ہند یعنے آج کا مغربی پاکستان سونے کی چڑیا کہلایا کرتا تھا۔

اس ہند کا چار دانگ عالم میں شہرہ تھا اور اس شہرت میں آج کے بھارت کا ذرہ بھر حصّہ نہیں۔ بھارت یعنے وادیِ گنگا اور جمنا ایسا گھرا ہوا علاقہ رہا ہے جس کا بیرونی دنیا سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بیرونی دُنیا اس سے روشناس تک نہیں تھی۔ اہل فارس اس کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ یونانی اسے جانتے تک نہیں تھے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ موریہ خاندان پنجاب سے اٹھ کر بھارت پر قابض ہو گیا تو بھارت 'ہند (مغربی پاکستان) کا ضمیمہ بن کے ہند کہلانے لگا۔ آج بھارت اپنے آپ کو ہند کہلاتا ہے اور موریہ خاندان کو اپنا سنہری دور کہتا ہے۔ یہ ایک تاریخی دھوکا ہے جو وہ دنیا بھر کو دے رہا ہے۔ نہ وہ "ہند" تھا، نہ موریہ خاندان "ہندو" تھا۔ بھارت ایک آریائی قبیلے کا نام تھا۔ اس کے نام پر ایک محدود سے علاقے یعنے یوپی کے چند مغربی اور پنجاب کے چند مشرقی اضلاع کا نام بھارت ہو گیا۔ اس علاقے کے مغرب میں وادیِ سندھ تھی، شمال میں ہمالیہ، مشرق میں بنگال اور مغرب میں راجپوتانہ کا صحرا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت بالکل الگ تھلگ رہا اور دنیا سے اس کا کوئی تہذیبی لین دین نہیں ہوا۔

دنیا سے الگ تھلگ رہنے کا نتیجہ تھا کہ بھارت تہذیب کا متعفن جوہڑ بن گیا۔ اس بند پانی میں نہ تازہ پانی باہر سے آیا، نہ اس کا کہیں نکاس ہی ہو سکا۔ آریہ جب مغربی پاکستان سے بے دخل ہو کر بھارت میں آئے تو انہوں نے اپنے ہمسایوں یعنے پنجاب کے لئے دل میں شدید نفرت بھر لی --- تاکہ وہ اپنے آپ کو ان صحت مند اثرات سے محفوظ رکھ سکیں جو خیبر کی شاہراہِ تاریخ سے سیلابی شکل میں وارد ہوتے رہتے تھے۔ بھارت کے بند پانی میں جو تاریخی سڑاند پیدا ہوتی اُسے ورن آشرم کہتے ہیں۔ اس کی اساس سرتاسر نفرت ہے۔ اپنوں سے نفرت، غیروں سے نفرت! ورن آشرم نے انسانوں کی جو غیر انسانی تقسیم کی وہ "کُلیتہً" برہمن کے مفاد کی خاطر تھی۔ برہمن نہ ہوتے تو یہ نظام معرضِ وجود میں نہ آتا۔ اور یہ نظام نہ ہوتا تو زمانہ برہمنوں کے وجود اور ان کی سمیّت سے محفوظ و مصئون رہتا۔ اس تقسیم کی رُو سے سب کچھ برہمن کے لئے تھا۔ یہ نظامِ برہمنیت آہستہ آہستہ ایک مت بن گیا۔ یہ مت بنا نہیں اسے از رہ تکلف مت کہا جانے لگا بغرض سہولت اسے مت تسلیم کر لیا جائے تو کہنا پڑے گا کہ ہندو کو نام تو وادیِ سندھ نے دیا اور مت

وادی گنگا نے۔

ایک وقت تھا کہ وادیٔ سندھ (مغربی پاکستان) کے رہنے والے اہل ہند کہلاتے تھے۔ اسی مناسبت سے وہ ہند کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ اس سے ایک علاقائی نسبت کی نشان دہی ہوتی تھی، کوئی مذہبی یا ثقافتی تشخص مراد نہیں تھا۔ اُس وقت دراصل کوئی واضح مذہب تھا بھی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ عائلی اور قبائلی معتقدات تھے اور وہ وسیع علاقے کے رہنے والوں میں قدر مشترک کا کام نہیں دیتے تھے۔ اس لئے یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اہل فارس نے جب اہل ہند (یعنی اہل مغربی پاکستان) کو ہندو کہا، تو ان کی مراد کسی ایک مت کے ماننے والوں سے تھی۔ یہ گروہ اسی طرح رہتے چلے گئے، یعنے ایک دوسرے سے مل جل کر بھی اور الگ تھلگ بھی تا آنکہ برصغیر میں مسلمان وارد ہوئے۔ کوئی پانچ سو سال تک مسلمان مغربی پاکستان کے علاقے میں رہے۔ ان کی شخصیت اور ان کے دین کا اثر اتنا غالب تھا کہ وادیٔ سندھ بنیادوں تک کچھ سے کچھ ہو گیا۔ مسلمان ایک ایسا گروہ تھے جس کا تشخص واضح تھا۔ اُن کے معتقدات اور تصورات اہل ہند کے معتقدات اور تصورات سے نمایاں طور پر مختلف تھے۔ اتنے مختلف کہ انہیں اہل ہند سے خلط ملط نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے اس لئے ان کی مناسبت سے دوسرے تمام گروہ غیر مسلم کہلانے یا سمجھے جانے لگے۔ چونکہ یہاں کے غیر مسلم مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو کہلاتے تھے اس لئے مرورِ زمانہ سے غیر مسلم اور ہندو ہم معنے ہو گئے۔ اس طرح آج ہندو کہلانے والوں کو مسلمانوں نے منفی بنیاد پر ایک طرح کا تشخص عطا کیا۔ چونکہ مختلف "ہندو" گروہ اعتقادات میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس لئے ہندو کے دائرے میں ایسے ایسے لوگ آ گئے جو ذہنی اور مذہبی طور پر ایک دوسرے سے بخطِ مستقیم برعکس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ لوگ بھی اپنے آپ کو ہندو کہلاتے ہیں جو بُت پرست ہیں اور تینتیس کروڑ خداؤں کو مانتے ہیں اور وہ بھی جو ایک خدا کو مانتے ہیں اور وہ بھی جو سرے سے خدا کو مانتے ہی نہیں۔

برہمن نے ورن آشرم کا جو ڈھونگ رچایا، اس میں اس نے برہمن کو یہ برتری تو نہ دی کہ وہ باقی سب پر حکومت کرے، بلکہ باقی طبقات کو ان کی خدمت اور ان کے مفاد کے تحفظ پر مامور کر دیا۔ اس سے برہمنوں کا کردار ایک سانچے میں ڈھل گیا۔ وہ کسی آنے والے سے نہیں الجھتے تھے۔ وہ الجھتے اس لئے نہیں تھے کہ ان کا مقصد حکومت کرنا نہیں تھا۔ وہ چاہتے صرف یہ تھے کہ نئے آنے والے ان کے مفاد کا تحفظ کریں۔ چنانچہ ہر آنے والے کے لئے وہ چشم براہ رہتے تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کا مقابلہ نہیں کیا۔ ہر ایک کا ساتھ دے کر وہ اس کے منتظر ہوئے کہ وہ ان کے مفاد کا تحفظ کرے گا۔ اگر وہ تحفظ کرتا تو ٹھیک ورنہ وہ بظاہر اس کا ساتھ دیتے

اور اندر اندر سے اسے کھوکھلا کر دیتے۔ جب وہ کمزور ہو جاتا تو یا اسے قتل کر کے ختم کر دیتے یا نئے آنے والے کا انتظار کرتے کہ وہ انہیں آکے مغلوب کرے۔ وہ نئے آنے والوں کا اس لئے بھی ساتھ دیتے کہ پرانے آئے ہوئے گروہ کو ان کی مدد سے ٹھکانے لگا دیں۔ آج کی اصطلاح میں بات کی جائے تو کہا جائے گا کہ برہمن نے ہمیشہ غلامی کو ترجیح دی۔ اور حکمرانوں سے یہ توقع رکھی کہ وہ ان کے مفاد کا تحفظ کریں گے۔ گویا نہ محض یہ کہ انہیں آزادی نصیب نہیں ہوئی بلکہ انہوں نے آزادی کی خواہش ہی کبھی نہیں کی۔ اسی بنا پر انہوں نے مسلمانوں کا ساتھ دیا اور اسی بنا پر انہوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ یہ سمجھ لینا مشکل نہیں کہ وہ کیوں ان دونوں کے رنگ میں رنگے گئے۔

باقی آنے والوں سے تو برہمن بآسانی عہدہ برآ ہوتا رہا لیکن مسلمانوں سے اس کا کٹھن مقابلہ پیش آگیا۔ یہ پہلا گروہ تھا جو وقت گزرنے پر کمزور تو ہو گیا لیکن جذب نہ کیا جا سکا۔ الٹا اس نے ورن آشرم کی بنیادیں ہلا کے رکھ دیں اور برہمنوں اور برہمنوں کے ماننے والوں کو اپنے دین کا حلقہ بگوش بناتا چلا گیا۔ برہمن کے لئے اس سے پیچھا چھڑانا ناممکن ہو گیا۔ جب انگریز برصغیر میں آنا شروع ہو گئے تو اس کی جان میں جان آئی۔ اس کی آس بندھی کہ انگریز اسے مسلمان سے نجات دلائے گا۔ چنانچہ اس نے انگریز سے مل کر مسلمان کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے۔ لیکن چونکہ مسلمان مٹ نہ سکا اور مسلمان اور غیر مسلم سب انگریز کے غلام ہو گئے، اس لئے غیر مسلم گروہوں کا تشخص دوابعادی ہو گیا۔ پہلے وہ غیر مسلم تھے۔ اب غیر انگریز بھی ہو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد برطانوی عمل داری کا آہنی دور شروع ہوا تو مغرب کا وطنیت اور قومیت کا تصور اس برصغیر میں جاگزین ہونے لگا۔ یہاں آکر برصغیر کے غیر مسلم ہندو بننے لگے اور اپنے آپ کو ایک قوم (اور ایک امت) کہنے لگے۔ گویا مسلمان کی نسبت سے جو تشخص منفی طور پر ابھرا، اس میں اثبات کا پہلو بھی جھلکنے لگا۔

لیکن برہمنی ذہنیت میں اثبات کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کا خمیر نفرت سے اٹھایا گیا اور اس میں وقت نے ایسا اشتداد پیدا کر دیا کہ اس جذبے کا استیصال بہت دشوار ہے۔ ہندو انگریز کے زیر اثر اپنے آپ کو ایک قوم اور ایک وطن کہلا کر آج کے ہندو اپنے لئے کوئی مثبت اساس مہیا نہیں کر سکے وہ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کا غیر شعوری ردِ عمل یہی تھا کہ ایک نیا آنے والا (انگریز) آگیا ہے تو پرانے (مسلمان) کو ٹھکانے لگانا چاہیئے۔ انہوں نے ہر نئے آنے والے کا استقبال کیا تھا اور ہر پرانے کو تہ تیغ کیا تھا۔ یہ عادت ان کی راسخ ہو چکی تھی۔ چنانچہ انہوں نے انگریز کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ نام نہاد ہندو مسلم فسادات کی اصلی وجہ ہندو کی یہی عادتِ مستمرہ ہے۔ اگر انگریز نہ آیا ہوتا اور

اس کا آئینی دور شروع نہ ہوگیا ہوتا یا مسلمانوں کا جذبہ تحفظِ ذات غیر معمولی طور پر قوی نہ ہوتا تو مسلمان برہمنی ذہنیت کی بھینٹ چڑھ گئے ہوتے۔ بہت سے ان میں سے قتل ہو جاتے اور باقی جذب کر لئے جاتے۔ اور آج ہندو اصنام میں کئی ایسے نام سننے میں آتے کہ مسلمان جن کا ورد کرتے اور جن پر اپنی جانیں نثار کرنے کے لئے تیار رہتے۔

ہندو مسلمان کو مٹا تو نہ سکا لیکن انگریز کے زیرِ سایہ اس کی نفرت کا سارا سیلاب مسلمان ہی کے گھر کی طرف بہنے لگا۔ مسلمان نے اس سیل کو پوری قوت سے روکا اور اس کے سامنے پاکستان کا بند باندھنے میں کامیاب ہوگیا۔ لیکن سوال بند باندھنے کا نہیں، اس تاریخی سٹرانڈ کو صاف کرنے کا ہے یہ بہرحال علیحدہ بحث ہے جسے پھر کسی وقت چھیڑا جائے گا۔

انگریز کے آنے کے بعد برصغیر میں جو جدوجہد آزادی شروع ہوئی اس کا جائزہ امعانِ نظر سے لیا جائے تو صاف دکھائی دے گا کہ ہندو مسلمانوں کے درپے آزار رہا اور اس نے انگریز سے یہ توقع نہیں رکھی کہ وہ ہندو کو آزادی دے دیگا بلکہ اس کا آلۂ کار بن کر مسلمانوں کا استیصال کرے گا۔ آزادی کا سوال تو مسلمانوں کے لئے پیدا ہوتا تھا۔ جو جداگانہ ملت تھے، برصغیر کے حکمران رہ چکے تھے اور اپنا تشخص کسی قیمت پر بھی ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ یہ سب بہرحال علیحدہ بحث ہے جو اپنے موقع پر چھیڑی جائے گی۔

تو گویا ہندو اپنی عادت کے مطابق انگریز کے پیچھے لگ گیا اور مسلمانوں کے درپے ہوگیا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کا استیصال تھا، انگریزوں کا اخراج نہیں تھا۔ اس کے لئے انگریز کے استیصال کا سوال کسی اور کے آنے پر پیدا ہوتا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ مسلمانوں کی جدوجہد کا ایسا نتیجہ نکلا جس کے لئے ہندو کا تحت الشعور تک تیار نہیں تھا۔ انگریز کے بعد کوئی اور آیا بھی نہیں اور ہندو بھی آزاد ہوگیا اور مسلمان نے بھی آزاد مملکت قائم کرلی۔ ہندو اپنی عادت سے مجبور ہو کر بدستور مسلمانوں کے درپے رہا۔ چنانچہ آزادی کے بعد مسلم دشمنی کی دو صورتیں پیدا ہوگئیں۔ ایک اندرون بھارت مسلمانوں کا استیصال اور دوسرے بین الاقوامی میدان میں پاکستان کا خاتمہ۔ صدیوں سے وہ نئے آنے والوں کے ساتھ مل کر پرانوں کا خاتمہ کرنے کا عادی چلا آرہا تھا۔ لیکن انگریز اسے چھوڑ کر ایسے چلا گیا کہ اس کی بجائے کوئی آنے والا نہیں آیا۔ ہندو اس صورت حال سے زیادہ پریشان نہیں ہوا کیونکہ اگر کوئی آنہیں رہا تھا تو اسے بلایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنی آزادی کا بھرم قائم رکھتے ہوئے سرکردہ اقوام عالم سے گٹھ جوڑ قائم کرنا شروع کر دیا اور مسلمانوں اور پاکستان کے خلاف قوت مجتمع کرنے لگا۔

ایک عرصہ تک بھارت کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی اور وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار رہا۔ اس کی

ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے اپنے آپ کو ہند اور انڈیا کہا اور کہلوایا۔ اس طرح اس نے وہ ساری تاریخ چرا کے اپنا لی جو وادیٔ سندھ یعنے مغربی پاکستان کی تھی۔ یہ چوری کر کے اس نے دنیا کو دہرا دھوکا دیا۔ ایک طرف اس نے اپنی عظمت اور قدامت کا سکہ چلایا اور دوسری طرف پاکستان کو بے تاریخ کا ملک ظاہر کیا۔ بھارت کے غبارے میں پنڈت نہرو نے بھی خوب ہوا بھری۔ اس فریب میں قریباً سبھی ملک آ گئے۔ پاکستان تنہا ملک تھا جو دنیا کو سمجھانے کی ناکام کوشش کرتا رہا کہ برہمن ذہنیت کس قدر عیار اور ناقابل اعتماد ہے یہ کوشش پاکستان ہی کر سکتا تھا کیونکہ مسلمان برہمن کو ایک ہزار سال سے جانتے تھے پاکستان کی خوش قسمتی کہ اس کے سب سے بڑے ہمسایہ یعنی چین کو بھی ہندو ذہنیت کا تجربہ ہو گیا اور اس کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ اس سے بین الاقوامی کشمکش میں ایک نئے عنصر کا اضافہ ہو گیا۔ آج ایشیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسی عنصر کی کرشمہ سازی ہے۔

بھارت چین کے ساتھ تھا اور "چینی ہندی بھائی بھائی" کے نعرے لگاتا تھا تو دنیا کو اس دھوکے میں مبتلا کرتا تھا کہ وہ چین اور باقی دنیا میں ایک رابطے کا کام دے رہا ہے۔ اس رابطے کی وہ امریکہ سے قیمت وصول کرتا تھا۔ یہ بین الاقوامی دلالی برسوں تک چلتی رہی۔ بھارت ایک تیر سے بزعم خود تین شکار کر رہا تھا یعنی چین، روس اور امریکہ۔ وہ تینوں کو خوش کر کے بلکہ تینوں کو دھوکا دے کر ان کے کندھوں پر کھڑے ہو کر دیگر اقوام عالم پر اپنی بڑائی کا رعب جماتا تھا۔ یہ کاٹھ کی ہنڈیا کچھ دیر ہی چل سکی۔ چین کی دوستی کا دم بھرنے کے باوجود بھارت نے موقع پا کر چین پر حملہ کر دیا۔ اسے یہ غلط فہمی یقیناً نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ چین کو نیچا دکھا سکے گا۔ اس نے سوچا غالباً یہ کہ وہ چین سے پٹ کے ہاتھ پاؤں پر پٹیاں باندھ کر روس اور امریکہ کے سامنے واویلا کرے گا کہ وہ اس کی چین کے خلاف مدد کریں۔ بھارت نے بھانپ لیا تھا کہ یہ حربہ کارگر نہیں ہے گا۔ روس اور چین کے تعلقات کشیدہ ہو چکے ہیں۔ اس سے بھارت کو یہ توقع پیدا ہوئی کہ روس چین کے خلاف اس کی مدد کرے گا۔ امریکہ تو چین کا خدا واسطے کا دشمن تھا ہی، وہ چین کے خلاف بھارت کی اندھا دھند امداد کرنے کے لئے تیار تھا۔ بھارت کے اندازے ٹھیک نکلے اور روس اور امریکہ بھارت کو اسلحہ خانہ بنانے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگے۔

بھارت اسے اپنی کامیابی سمجھتا ہے اور اس صورت حال پر خوش ہے۔ بظاہر یہ صورت حال اس کے حق میں مفید ہے لیکن اسی میں خرابی کی صورت مضمر ہے' اس کے لئے بھی اور اس کے ہمسایوں کے لئے بھی۔ امریکہ جب سے چین سے بے دخل ہوا ہے وہ تنکوں کا سہارا لے کر چین کے خلاف محاذ بنانے کی مجنونانہ تگ و دو کر رہا ہے۔ کوریا میں وہ چین کے خلاف لڑا اور ناکام رہا۔ ویٹ نام میں بھی وہ

چین ہی کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اس لڑائی میں اس کی کامیابی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے سرکاری نقیب بھی اس کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔ ویٹ نام کا میدان اس کے ہاتھ سے جا کے رہیگا لیکن پسپا ہونے سے پہلے وہ نیا میدان تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ یہ میدان بھارت ہے۔ بھارت جیسا آسان آلۂ کار امریکہ کو ایشیا میں کہیں اور نہیں مل سکتا۔ اس نے امریکہ کے اشارے پر چین سے لڑائی چھیڑی اور منہ کی کھائی۔ بھارت اور امریکہ دونوں کو اس لڑائی سے اچھی طرح یہ اندازہ ہو گیا کہ جب تک پاکستان بھارت کے ساتھ نہیں دیتا، چین کے خلاف موثر محاذ قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ پاکستان کو راہِ راست پر لانے کے لئے پچھلے سال اس پر حملہ کرایا گیا۔ یہ حملہ بُری طرح ناکام ہوا، اور بھارت کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ چین اور پاکستان دونوں سے شکست کھا کر بھی بھارت کی دم سیدھی نہیں ہوئی۔ اُلٹی یہ اور ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ اب وہ چین اور پاکستان کی دہائی دے دے کر امریکہ اور روس سے پیسے اور اسلحہ کی بھیک مانگ رہا ہے۔ اور یہ بھیک اسے مل بھی رہی ہے اور بڑی بے دریغی سے۔

اس سے بھارت کے ہمسایوں بالخصوص پاکستان کے لئے تو خطرہ بڑھا ہی ہے، خود بھارت کے لئے بھی اچھے آثار نظر نہیں آ رہے۔ امریکہ اور روس جس بے تکلفی سے بھارت کی بساطِ سیاست پر آنمودار ہوتے ہیں، اس سے بھارت کا نقشہ اشتراکی انقلاب سے پہلے کے چین کا سا ہو رہا ہے۔ حکومت کا میلان، چین کی طرح، امریکہ کی طرف ہے، لیکن عوامی رائے امریکہ اور حکومت دونوں کے خلاف ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے، بالکل چین کی طرح، بائیں بازو کے رجحانات کو تقویت ملتی جا رہی ہے۔ گویا چین کی طرح بھارت میں بھی دائیں اور بائیں بازو کی کشمکش تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں جیت آخر کار بائیں بازو کی ہوگی کیونکہ اسے عوامی تائید حاصل ہوتی چلی جائے گی۔ یہ عمل تدریجی ہوگا اور اسے نتیجہ خیز ہونے کے لئے ایک عرصہ درکار ہوگا لیکن نتیجہ اس سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ بھارت چین کا ہوّا کھڑا کر کے امریکہ سے زیادہ سے زیادہ جنگی اور معاشی امداد بٹور رہا ہے۔ امریکہ کے بھارت میں زیادہ سے زیادہ دخیل ہوتے چلے جانے سے تنقید اور اعتراض کی جو گنجائش پیدا ہوتی ہے، اسے کم کرنے کے لئے بھارت روس کو اسی طرح اپنے ہاں مدعو کرتا چلا جا رہا ہے۔ ایسا وہ اپنی غیر شعوری عادت کے طور پر کر رہا ہے کہ اسے اپنے مخالفین سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمیشہ دوسروں کا ہی سہارا لینا پڑا ہے۔ بلکہ برہمن نے یہ کام کبھی اپنا نہیں سمجھا۔ اس نے ہمیشہ یہ کام دوسروں سے کرایا۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے یہ کام کرنے والے باہر سے خود آجایا کرتے تھے لیکن اب وہ آزاد ہو گیا ہے اور باہر سے آمد کا تاریخی سلسلہ رک گیا ہے تو وہ خود ان کو بلا بلا کر

اپنے مزعومہ مخالفین کے خلاف استعمال کر رہا ہے۔ بھارت کی توقع یہ ہے کہ امریکہ کے اثر کو روس زائل کرے گا، اور روس کے اثر کو امریکہ۔ اور دونوں کی موجودگی سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر وہ عالمی جنگی قوت بن جائے گا۔

نظریہ ظاہراً اس کے اندازے ٹھیک ہیں، لیکن یہ بھانپنے کے لئے ذہن پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ بھارت بجائے خود ایک محاذ بنتا جا رہا ہے اور اس محاذ پر بتدریج دو فریق ایک دوسرے کے خلاف برسرِ آنا نظر آئیں گے۔ یہ حریف ہوں گے امریکہ اور روس۔ وہ دیکھنے کو تو ایک دوسرے کے معاون ہیں اور دونوں اس پر متفق نظر آتے ہیں کہ بھارت کو ہر طرح کی امداد بے دریغ سے دی جائے۔ لیکن درحقیقت وہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں، بالکل اسی طرح، جیسے چین میں کہتے: چین میں اس تصادم کا جو نتیجہ نکلا، وہ ہمارے سامنے ہے۔ بھارت میں جو نتیجہ نکلے گا اس کی پیش گوئی مشکل نہیں۔

بھارت کے اس کردار نے جو صورتِ حال پیدا کر دی ہے وہ گہری توجہ کی مستحق ہے۔ برصغیر کی آزادی سے استعمار فرنگ کا خاتمہ ایشیا میں کم از کم یقینی نظر آنے لگا تھا۔ برصغیر سے انگریز کے بیدخل ہو جانے کے بعد چین نے امریکہ کو اپنے ہاں سے نکال باہر کیا۔ امریکہ نے بعد میں کوریا کے چور دروازے سے گھسنے کی کوشش کی تو اس کوشش کو ناکام بنا دیا گیا۔ ہند چینی نے اپنے طور پر فرانس سے گلو خلاصی کرا لی لیکن استعمار کی یہ سمٹتی رو بھارت کی سعی سے پھر ابھرنی شروع ہو گئی۔ بھارت کی برہمنی ذہنیت آزادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اپنے مقاصدِ مشئومہ کی تکمیل کے لئے آلۂ کار چاہیئے تھے — وہ امریکہ کی شکل میں اُسے حاصل ہو گئے۔ گو حالات سے مجبور ہو کر پاکستان نے ۱۹۵۴ء میں امریکہ سے فوجی معاہدہ کیا اور فوجی امداد حاصل کرنے کی طرح ڈالی، اور اس کے لئے اسے جان بوجھ کر بدنام کیا گیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سے تین سال قبل بھارت بڑی عیاری سے امریکہ سے اسلحہ حاصل کرنے کا معاہدہ کر چکا تھا۔ اس نے امریکہ سے ایسی ملی بھگت کی، کہ امریکہ کو یقین ہو گیا کہ ایشیا میں استعمار کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ چنانچہ اُسے ویٹ نام کا چور دروازہ مل گیا۔ یہ دروازہ بھارت کی ملی بھگت کے بغیر کبھی نہ کھل سکتا، چین بھارت، پاکستان، ہند چینی جیسے وسیع و عریض علاقوں سے بے دخل ہو کر استعمار فرنگ ایشیا میں پھر سے قدم جمانے کے قابل نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن بھارت نے ایسی فضا پیدا کی، کہ امریکہ اس دیدہ دلیری سے آدھمکا کہ فرانس اور برطانیہ جیسی روایتی استعماری قوتوں کی پیشانی بھی عرق آلود ہو گئی ہو گی۔ بھارت کے رویہ سے امریکہ کو ایسی شہ ملی ہے کہ اس نے ایشیائی سمندروں میں بحری بیڑوں کا جال پھیلا دیا ہے۔ اپنے آپ کو حساس ایشیائی کہلانے والا پنڈت نہرو بھی بغلیں بجاتا نظر آتا تھا کہ امریکی بیڑہ بحرِ عرب سے بحرالکاہل کے درمیان

سمندر میں پھیل گیا ہے۔ وہ کھل کر اس کی بھی تردید نہیں کر سکا کہ بھارتی جزائر انڈمان اور نکوبار میں اس بڑے کو بعض سہولتیں حاصل ہوں گی۔

گویا بھارت پوری طرح امریکی استعماریت کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ ایسا وہ غیر شعوری طور پر کر رہا ہے کیونکہ برہمنی ذہنیت کا یہی مظاہرہ صدیوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ دراصل بھارت کی مشکل بڑی بنیادی ہے۔ اس کے خناس کا علاج اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کے تحت الشعور سے برہمنی اثرات زایل نہیں ہو جاتے۔ یہ اثرات فوجی شکست سے دب سکتے ہیں، اصلاح پذیر نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس کے عسکری پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اس تاریخی جدوجہد کا لازمی حصہ ہے۔ لہٰذا پاکستان کو اس سے غافل نہیں ہونا چاہیئے۔ بھارت کا سنگین خطرہ ہمارے سروں پر منڈلاتا رہے گا تا آنکہ برہمنی ذہنیت کا کلی استیصال ہو جائے۔ اس کا استیصال بالآخر اسلام کے ہاتھوں ہوگا۔ مسلمان کم و بیش ایک ہزار سال سے اس کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ پاکستان قائم کر لینے میں کامیاب ہو گئے اور یہ تاریخی کامیابی ہے۔ برہمنیت کی اصلاح کے سارے مہم کے لیے مشیت نے پاکستان کو چنا ہے۔ پاکستان ہی کو برہمنیت سے پالا پڑا ہے اور پاکستان ہی اس زہر میں بجھے ہوئے نشتر کی ہلاکت آفرینی کا صحیح اندازہ دان ہے۔ یہ کام بالآخر اسلام ہی کے ہاتھوں انجام پذیر ہوگا۔ گویا پاکستان ایک تاریخی کارنامے کا کردار ہے۔ جب تک برہمنیت کے ڈرامے کا ڈراپ سین نہیں ہو جاتا، استعمار کا خاتمہ نہیں ہو سکتا، نہ اقدار انسانیہ کو فروغ مل سکے گا۔ اسلام کا راستہ اشتراکیت کے ہاتھوں ہموار ہو سکتا ہے، اور ہو رہا ہے۔ چین اور پاکستان کی رفاقت میں مشیت کا ہاتھ ہے۔ بھارت بلاوجہ چین اور پاکستان کو دشمن نہیں سمجھتا۔ یہ اسکے نفسیاتی مرض کی واضح علامت ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر جانتا ہے کہ اس کے مرض کا علاج یا چین کے پاس ہے، یا پاکستان کے پاس؛ یعنی برہمنیت کی لعنت یا اشتراکیت سے پاک ہوگی یا اسلام سے! وہ دونوں سے برسرِ پیکار ہے! اور انسانیت اس کے جنازہ نکلنے کی منتظر ہے کہ ع

مرگِ اُو، اہل جہاں را زندگی است!

خریداروں کے لئے

ضروری ہے کہ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع متعلقہ مہینے کی پندرہ تاریخ تک دیں۔ اس کے بعد ہم پرچہ بھیجنے کے مکلف نہیں ہوں گے۔ خط و کتابت میں اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیئے۔

اساسِ محکم

طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۶۶ء کے لمعات میں جو خیالات پیش کئے گئے، ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ملک کے ہوشمند سنجیدہ طبقہ نے انہیں بڑی توجہ سے پڑھا اور گہرے غور و تدبر کا مستحق سمجھا، لیکن اس سلسلہ میں مختلف گوشوں سے جو استفسارات موصول ہوئے ہیں، ان میں ایک سوال قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے اس قابل ہے کہ اس کی مزید وضاحت کی جائے۔ ہم نے کہا یہ تھا کہ روس میں کمیونزم اس لئے ناکام ہو گئی ہے کہ ان کے پاس وہ اساسِ محکم نہیں جس پر یہ عمارت استوار کی گئی تھی۔ اور چونکہ چین کے ہاں بھی اس اساس کا فقدان ہے اس لئے وہاں بھی یہ کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ اس سلسلے میں ہم سے پوچھا گیا ہے کہ وہ اساسِ محکم کیا ہے جس کی عدم موجودگی سے ان کا اس قدر انقلابی پروگرام کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ اور اسلام وہ کون سی اساس مہیا کرتا ہے جس سے اس کا عالمگیر معاشی پروگرام کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ سوال بڑا اہم اور بنیادی ہے۔ لیکن ہم نے اُن لمعات میں اس کی وضاحت اس لئے نہیں کی تھی کہ اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں بڑی شرح و بسط سے بہ اصرار و تکرار لکھا جا چکا ہے ـــــ پرویز صاحب کے مقالات، خطبات اور تشریحات، اور اس موضوع پر ان کی مستقل تصنیف "نظامِ ربوبیت" میں اس سوال کو بڑی وضاحت سے سامنے لایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ طلوعِ اسلام کے قارئین کا حلقہ دن بدن وسیع ہو رہا ہے اس لئے ان نو واردان کی طرف سے اس قسم کے استفسارات فطری اور لابدی ہیں۔ بنا بریں ہم نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نکتہ کی مزید وضاحت کر دی جائے۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ مسئلہ زیرِ نظر ہے کیا؟ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کمیونزم محض ایک معاشی نظام کا نام ہے، جسے کبھی سوشلزم اور کبھی کمیونزم کہا جاتا ہے۔ یہ خیال غلط ہے۔ مارکس

نے ایک فلسفۂ زندگی دیا تھا جس پر ایک معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ یہ معاشی نظام اپنی ابتدائی اسٹیج میں سوشلزم کہلاتا ہے اور اس کی انتہائی شکل کا نام کمیونزم ہے۔ سوشلزم اور کمیونزم میں قدر مشترک یہ ہے کہ وسائل پیداوار، افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے مملکت کی ملکیت میں رہتے ہیں جو مزدوروں اور کاشتکاروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ ان میں فرق یہ ہے کہ سوشلزم میں:

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور
کام کا معاوضہ دیا جاتا ہے۔

اور کمیونزم میں۔

ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لیا جاتا ہے اور اس کی
ضروریات کے مطابق دیا جاتا ہے۔

جہاں تک سوشلزم کا تعلق ہے، اس میں بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ "کام کا معاوضہ" کس معیار کے مطابق مقرر کیا جاتا ہے؟ سرمایہ دار ملکوں میں بھی مزدور کو اس کے کام کی اجرت ملتی ہے، انجنیئر کو اس کے کام کی اجرت۔ پھر سوشلزم میں جو کچھ کسی کی ضروریات سے زاید ہوتا ہے وہ اس کی ملکیت میں رہتا ہے۔ یہی کیفیت سرمایہ داری نظام میں ہوتی ہے۔ سوشلسٹ نظام میں البتہ اس فاضلہ دولت سے جائیدادیں نہیں کھڑی کی جا سکتیں، روزمرہ کی اشیائے مستعملہ خریدی جا سکتی ہیں۔ نظام سرمایہ داری کے حامیوں کا اس کے خلاف اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی کو جائیدادیں بنانے (یعنے وسائل پیداوار کو اپنی ملکیت میں لینے) کی اجازت نہ ہو تو اس کے لئے کام کرنے کا جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) نہیں رہتا۔ یہ اعتراض کمیونزم کے نظام میں اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں کام ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق لیا جاتا ہے، لیکن دیا جاتا ہے انہیں ان کی ضروریات کے بقدر۔ ظاہر ہے کہ۔

اس معاشرہ میں کام کرنے والا طبقہ دو گروہوں میں تقسیم ہو جائے گا۔ ایک وہ جن کے کام کا ماحصل ان کی ضروریات سے زاید ہو۔ اور دوسرا وہ جن کی محنت کی پیداوار ان کی ضروریات پوری نہ کر سکیں۔

کمیونزم کے نظام کی رُو سے، اول الذکر طبقہ کی زائد از ضروریات کمائی، ثانی الذکر طبقہ کی ضروریات پورا کرنے کے کام میں لائی جائے گی اور یوں معاشرہ کی ناہمواریاں دور کر دی جائیں گی۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ (اول طبقہ کے افراد میں سے) جسے یہ معلوم ہو کہ وہ خواہ کتنا ہی کام کیوں نہ کرے اسے اس کی ضروریات سے زاید کچھ نہیں مل سکے گا۔ اور ثانی الذکر طبقہ کو اس کا علم ہو کہ وہ کتنی ہی کم محنت کیوں

نہ کریں، ان کی ضروریات بہرحال پوری ہوتی رہیں گی، تو وہ جذبۂ محرکہ کیا ہوگا جس سے یہ سب جان مار کر پوری پوری محنت کریں گے۔ یہ ہے اصل سوال! یہ ہے وہ نقطۂ ماسکہ جس کے گرد اس نظام کی پوری مشینری گردش کرتی ہے۔

ظاہر ہے کہ جذبۂ محرکہ، اس نظریۂ زندگی سے پیدا ہوتا ہے جس پر انسان کو ایمان ہو۔ نظامِ سرمایہ داری میں نظریۂ زندگی یہ ہے کہ تم جس قدر کمائی کرو وہ سب کی سب تمہاری ملکیت ہوگی۔ تمہیں اس سے غرض نہیں کہ معاشرہ میں دوسروں پر کیا گزرتی ہے۔ یہ نظریہ، وہ جذبۂ محرکہ پیدا کرتا ہے جس سے انسان زیادہ سے زیادہ محنت کرتا اور سب کچھ اپنے لئے رکھتا ہے۔ لیکن کمیونزم کا نظام، نصب العین یہ پیش کرتا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ محنت کرو لیکن تمہیں ملے گا اتنا ہی جس سے تمہاری ضروریات پوری ہوسکیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جو فلسفۂ حیات وہ پیش کرتا ہے، وہ انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا کرسکتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرکے، اپنی ضروریات سے زائد، سب کا سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دیدے۔؟

کمیونزم کا فلسفۂ حیات خالص مادی (MATERIALISTIC) ہے اس فلسفۂ زندگی کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کی زندگی، دیگر حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے، جس میں جذبات محرکہ محض حیوانی تقاضے (ANIMAL INSTINCTS) ہوتے ہیں۔ یہ تقاضے، جیسا کہ اربابِ علم و تحقیق کو معلوم ہے — (۱) تحفظِ خویش (SELF - PRESERVATION) اس مقصد کے لئے (۲) غلبۂ خویش (SELF AGGRESSION) اور (۳) افزائشِ نسل (SELF REPRODUCTION) ہیں۔ ان میں، نہ تو کسی دوسرے کی ضروریات پورا کرنے کا تصور پیدا ہوسکتا ہے اور نہ ہی تحفظِ خویش کے لئے "جائز اور ناجائز" کی تمیز کا سوال ابھرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر، مادی نظریۂ زندگی میں، بلند اقدار (HIGHER VALUES) کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اس میں معاشرہ کا ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے، معاشرتی قوانین و ضوابط کی پابندی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ یہ چیز وہی ہے جسے حیوانات میں (HERD INSTINCT) کہا جاتا ہے یعنے جب ایک فرد محسوس کرتا ہے کہ گروہ کے ساتھ رہنے میں وہ زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے تو وہ گروہ کے عاید کردہ قواعد و ضوابط کی پابندی کرتا ہے۔ اس وقت ساری دنیا میں نظریۂ حیات مادی (MATERIALISTIC) کارفرما ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ خطۂ ارض، انسانوں کی بستی نہیں، درندوں کا بھٹ بنکر رہ گیا ہے۔ اس وقت زمین پر بسنے والے انسان، حیوانی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا جذبۂ محرکہ احساسِ قومیت

(NATIONALISM) ہے — یعنی (HERD INSTINCT) - بلند انسانی اقدار کا تصور کہیں نہیں - نظامِ سرمایہ داری، اس تصورِ حیات کا لازمی نتیجہ ہے - اس فلسفۂ حیات کے تابع کوئی دوسرا نظام بروئے کار آ ہی نہیں سکتا -

لیکن کمیونزم، اس قسم کے خالص مادی نظریۂ حیات کے تابع، وہ معاشی نظام قائم کرنا چاہتی ہے جس کی اس نظریہ کے اندر گنجائش ہی نہیں - جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، مادی نظریۂ حیات (یعنے حیوانی سطحِ زندگی) میں، دوسروں کی ضروریات کے احساس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد یہ ہے کہ انسان، اپنا خون پسینہ ایک کرکے، زیادہ سے زیادہ کام کرے، اور اس کے ماحصل میں سے بقدر اپنی ضروریات کے رکھ کر باقی سب دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دے - یہ اجتماعِ ضدین ہے - یہ جمع بین النقیضین ہے - یہ تصور (SELF-CONTRADICTORY) ہے - یہ فارمولا ناقابلِ عمل ہے - مادی نظریۂ زندگی اس قابل ہی نہیں کہ انسان کو حیوانی سطحِ زندگی سے بلند لے جا کر اس کے سینے میں کسی بلند انسانی قدر کا احساس پیدا کر دے - لہٰذا جب کمیونزم کے نظریۂ حیات کی رُو سے بلند انسانی قدر پیدا ہی نہیں ہو سکتی تو وہ نظام جس کی قوتِ محرکہ بلند انسانی اقدار ہیں، چل کس طرح سکتا ہے؟

کمیونزم جو ہنگامی انقلاب لاتی ہے (اسے "انقلاب" کی بجائے، انتشار کہنا زیادہ مناسب ہے) اس کا جذبۂ محرکہ نفرت اور انتقام ہوتا ہے - یعنی وہ غریبوں اور محنت کشوں سے کہتی ہے کہ دیکھو! یہ سرمایہ دار تمہاری محنت کی کمائی کو کس طرح لوٹ کھسوٹ کر لئے جا رہے ہیں - تم اٹھو اور ان سے اپنی غصب شدہ دولت چھین لو - اس سے ان کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں اور وہ اٹھ کر ان سے اسبابِ پیداوار چھین لیتے ہیں - جب تک یہ طبقہ باقی رہتا ہے ان کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات بھی ابھرتے رہتے ہیں - جب اس کا خاتمہ ہو کر، کمیونزم کا اپنا نظام قائم ہو جاتا ہے — تو یہ جذبات (نفرت و انتقام بھی) ختم ہو جاتے ہیں - اس کے بعد انہی (سابقہ) مزدوروں اور محنت کشوں سے کہا جاتا ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ محنت کرو، لیکن اس میں سے تمہیں صرف بقدر تمہاری ضروریات کے ملے گا - اس سے زیادہ نہیں ملے گا - وہ سوچتے ہیں کہ اس نظام میں، اور نظامِ سرمایہ داری میں فرق کیا ہے؟ نظامِ سرمایہ داری میں بھی ہم زیادہ سے زیادہ محنت کرتے تھے اور اس میں سے ہمیں بقدر اپنی ضروریات ہی کے ملا کرتا تھا (بلکہ بعض اوقات اس سے کچھ زیادہ ہی مل جاتا تھا) اور اب بھی ہم سے یہی کہا جا رہا ہے؟ نتیجہ اس کا یہ کہ، اس انقلاب کی السابقون الاولون (PIONEERS)

کی جماعت کے بعد، وہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا جو اس انقلاب کو قائم رکھ سکے۔ اس سے ان کی اگلی نسل مجبور ہو جاتی ہے، کہ اس نظامِ سرمایہ داری سے سمجھوتہ کر لے جو ان کے فلسفۂ حیات کا لازمی نتیجہ ہے۔ ایک آدھ نسل، محض پندارِ نفس کی بنا پر، اس قسم کا سمجھوتہ کرتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی نظامِ سرمایہ داری قائم ہو جاتا ہے۔ مادی نظریۂ حیات کے ماتحت، اس نظام سے مختلف کوئی دوسرا نظام قائم رہ نہیں سکتا۔ آپ اس نظریۂ حیات کے مدعی (اشتراکی) سے کہیئے کہ آپ کہتے ہیں کہ میں جان مار کر محنت کروں اور اس میں سے پھر بقدر اپنی ضرورت کے رکھ کر باقی سب دوسروں کو دے دوں ——— میں ایسا کیوں کروں؟ آپ دیکھیں گے کہ اس "کیوں" کا اس کے پاس کوئی تسلی بخش جواب نہیں ہوگا — اسے مجبوراً یہ کہنا پڑے گا کہ ایسا کرنا انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے۔ لیکن ایسا کہنے سے اس نے کمیونزم کے نظریۂ حیات کو خیرباد کہہ دیا۔ کمیونزم کا نظریۂ حیات صرف طبعی قوانین (PHYSICAL LAWS) کو تسلیم کرتا ہے، اور طبعی قوانین میں کسی سے ہمدردی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ "ہمدردی" ایک انسانی جذبہ ہے، فطرت کا طبعی قانون نہیں۔ ایک بیوہ ماں جس کے جوان بیٹے کے کپڑوں میں آگ لگ جائے، وہ آگ کی ہزار منتیں کرے کہ اس بچے کے مرجانے سے میں تباہ و برباد ہو جاؤں گی۔ میرا دنیا میں کوئی نہیں رہے گا۔ اسے مت جلاؤ۔ وہ آگ اس کی ایک نہیں سنے گی۔ اس کے سینے میں ہمدردی کی رمق تک پیدا نہیں ہوگی ——— چارہ کھانے والا بیل، بھوکے بیل کو اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتا — یہ طبعی قانون کا فطری نتیجہ ہے۔ لیکن اگر کسی کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا بھی ہو جائے، تو یہ فلسفۂ زندگی نہیں بن سکتا۔ اس لئے اسے کسی مستقل انقلاب کی اساس قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آج دنیا میں جو انسانی ہمدردی اس طرح مفقود ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیا میں مادی نظریۂ حیات کا دور دورہ ہے۔ لہٰذا مادی نظریۂ حیات کی قائل (بلکہ پرستار) کمیونزم، انسانی ہمدردی کا واسطہ کس طرح دلا سکتی ہے؟ اور اگر وہ اس جذبہ کو اپیل بھی کرے تو ایسی قدر عظیم انقلاب کی اساس کیسے بن سکتی ہے۔ انقلاب کی اساس سطحی جذبات نہیں بن سکتے، کوئی محکم فلسفۂ زندگی ہی بن سکتا ہے۔

کمیونزم کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ وہ ایمان رکھتی ہے مادی نظریۂ حیات پر جس میں بلند انسانی اقدار کا تصور ہی ناپید ہوتا ہے اور نظام قائم کرنا چاہتی ہے وہ جس کی بنیاد ہی بلند انسانی اقدار بن سکتی ہیں یہ ——— منکرِ مے بودن و ہمرنگِ مستاں زیستن ——— کی زندگی دو قدم بھی نہیں چل سکتی۔ یہ ہے مطلب ہمارے اس کہنے کا کہ کمیونزم کے پاس وہ اساس محکم نہیں جس پر اس کے اسقدر بلند آہنگ معاشی نظام کی سربفلک عمارت قائم ہو سکے۔

یہ اساسِ محکم، قرآنِ کریم مہیا کرتا ہے۔ اس کا پیش کردہ تصورِ حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی، حیوانات کی طرح محض طبیعی زندگی نہیں۔ وہ طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی رکھتا ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY)۔ یا نفس (SELF)۔ یا خودی کہا جاتا ہے۔ انسان کا جسم تو طبیعی قوانین کے تابع زندہ رہتا اور انہی کے مطابق ایک دن مردہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی ذات نہ قوانینِ طبیعی کے تابع ہوتی ہے، نہ ہی جسم کی موت سے فنا ہو جاتی ہے۔ یہ جسمانی موت کے بعد بھی زندہ رہتی ہے اور اگر اس کی مناسب نشوونما ہو چکی ہو تو یہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو کر حیاتِ جاوداں حاصل کر سکتی ہے۔ انسانی جسم کی نشوونما طبیعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے، لیکن انسانی ذات کی نشوونما ان بلند انسانی اقدار کی پابندی سے ہوتی ہے، جو عقلِ انسانی کی پیداوار نہیں ہوتیں، بلکہ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کا سرچشمہ خارجی (OBJECTIVE) ہوتا ہے داخلی (SUBJECTIVE) نہیں۔ ان اقدار (VALUES) میں ایک بنیادی قدر یہ ہے کہ انسان جس قدر دوسروں کی ضروریات کے لئے دے، اسی قدر اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ ان اقدار پر ایمان، انسان کے اندر یہ جذبۂ محرکہ بیدار کرتا ہے کہ وہ جان مار کر زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں سے کم از کم اپنی ضروریات کے لئے رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا چھوڑ دے، تاکہ اس کی اپنی ذات کی زیادہ سے زیادہ نشوونما ہو سکے۔ ان اقدار پر ایمان وہ اساسِ محکم ہے جو اس قدر عظیم معاشی نظام کی بلند و بالا عمارت کا بوجھ برداشت کرنے کی متحمل ہو سکتی ہے۔

کمیونزم اپنے نظام کو دو مراحل میں سے گذارتی ہے۔ مرحلہ اول کو سوشلزم کہا جاتا ہے۔ اور مرحلہ دوم کو کمیونزم۔ پہلے مرحلہ میں اصول یہ ہوتا ہے کہ

> ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لو اور کام کے مطابق معاوضہ دو۔

دوسرے مرحلہ میں اصول یہ کارفرما ہوتا ہے کہ۔

> ہر ایک سے اس کی استعداد کے مطابق کام لو اور اسکی ضروریات کے مطابق اُسے دو۔

[ابھی اشتراکی ممالک مرحلہ اوّل ہی سے گذر رہے ہیں۔ مرحلہ دوم تک ان میں سے کوئی نہیں پہنچا۔]

اور ان کے نظام کی شکست و ریخت مرحلہ اوّل ہی میں ہونے لگ گئی ہے۔ اس مرحلہ کو قابلِ عمل بنانے کے لئے ضروری تھا کہ وسائلِ پیداوار مملکت کی تحویل میں چلے جائیں۔ جذبۂ محرکہ نہ ہونے کی وجہ سے، لوگ اسے بھی برداشت نہیں کر رہے کہ وسائل پیداوار ان کی ملکیت میں نہ رہیں (روس اس وقت اسی بحران سے دوچار ہے)۔ اور جب مرحلہ اول ہی میں یہ حالت ہے تو یہ ظاہر ہے کہ مرحلہ دوم میں قدم تک رکھنا بھی اس نظام کی قسمت میں نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم بھی اپنے معاشی نظام کی انتہائی منزل تک بتدریج لے جاتا ہے — اِنَّ اللّٰہَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ — (۱۶/۹۰) اس کا بنیادی مسلک ہے۔ عدل کا تعلق مرحلہ اول سے ہے، جس میں ہر ایک کو اس کے کام کا پورا پورا معاوضہ دیا جاتا ہے۔ "لیکن پورا معاوضہ لے کر یہ لوگ (مومن) اس مال و دولت پر سانپ بن کر نہیں بیٹھ جاتے کیونکہ انہیں ساتھ ہی "فحشاء و منکر" سے روکا گیا ہے۔ یعنے بخل اور عقل فریب کار کی حیلہ جوئیوں سے جو ان کو صرف مفاد خویش کا تحفظ سکھاتی ہے۔ اس مرحلہ میں افراد معاشرہ، دیگر ضرورت مندوں کی مدد کرنے کا کام انفرادی طور پر کرتے ہیں۔

اس ٹریننگ کے بعد، قرآن کریم اس کاروان کو دوسری منزل میں لے جاتا ہے جہاں یہ اجتماعی طور پر احسان پر کاربند ہوتے ہیں۔ احسان کے معنی ہیں دوسرے کی کمی کو پورا کر کے اس کے توازن کو برقرار رکھنا۔ یہاں ان کا مسلک یہ ہوتا ہے کہ — یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)۔ یہ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضروریات کے لئے کہاں تک کھلا رکھیں۔ ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضروریات سے زاید ہو، سب کا سب۔" چونکہ ان کے اس عمل کی بنیاد ان کے اس ایمان پر ہوتی ہے کہ ہم جس قدر دوسروں کی ضروریات پورا کرنے کے لئے دے دیں گے اسی قدر ہماری اپنی ذات کی نشوونما ہوتی جائے گی، اس لئے وہ اس حد سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں اور ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ وَ لَوْ کَانَ بِہِمْ خَصَاصَۃٌ — (۵۹/۹) وہ خود تنگی میں گذارہ کر لیتے ہیں اور دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔" اور چونکہ وہ یہ سب ایثار اپنی ذات کی نشوونما کے لئے کرتے ہیں، اس لئے وہ جن کی مدد کرتے ہیں ان سے کہدیتے ہیں کہ — لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُکُوْرًا ۔ (۷۶/۹) ہم تم سے اس کا کوئی بدلہ نہیں چاہتے۔ حتیٰ کہ ہم شکریہ تک کے بھی متمنی نہیں۔" واضح رہے کہ یہ ذہنیت اور اندازِ زیست جماعتِ مومنین کے مستثنیٰ افراد (EXCEPTIONAL INDIVIDUALS) کا نہیں بلکہ

اس پوری کی پوری جماعت کا ہوتا ہے، جس کے ہاتھوں یہ انقلاب رونما اور یہ نظام متشکل ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے ہر مومن کا انداز نگاہ، اور نہج زندگی یہی ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک، جو شخص مسلمان ہونا چاہئے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک معاہدہ پر دستخط کرے۔ یعنی اس معاہدہ پر جس میں کہا گیا ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ۔ (۹/۱۱۱)

یہ، مسلمان ہونے والا فرد، معاہدہ کرتا ہے کہ میں نے اپنا جان اور مال بیچ دیا ہے اور اس کے بدلے میں جنت خرید لی ہے۔ ان افراد کے مجموعہ کا نام ہے وہ جماعتِ مومنین، جو اس نظام کو قائم کرتی ہے۔ یہ نظام اس قسم کے افراد کے علاوہ، اور کسی کے ہاتھوں قائم نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ اس کے لئے جس جذبۂ محرکہ کی ضرورت ہے وہ اس ایمان کے علاوہ اور کسی صورت میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس معاہدہ کی رُو سے ذاتی ملکیت کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے دو باتیں واضح طور پر سامنے آگئیں۔

(۱) مادی نظریۂ حیات کا لازمی نتیجہ، نظام سرمایہ داری ہے۔ جو معاشرہ اس نظریۂ حیات کا حامل ہوگا اس میں سرمایہ داری کے علاوہ کوئی دوسرا نظام چل نہیں سکتا۔ کمیونزم کی بنیادی کمزوری یہ ہے کہ یہ نظریۂ حیات تو رکھتی ہے مادی، اور نظام قائم کرنا چاہتی ہے ایسا جو سرمایہ داری کے نظام کی ضد ہے۔ یہ اجتماعِ ضدین ناممکن ہے۔

(۲) قرآن کریم مادی نظریۂ حیات کا مخالف ہے۔ اس لئے یہ نظامِ سرمایہ داری کا بھی مخالف ہے یہ جس نظریۂ زندگی کا پیامبر ہے، اس کی رُو سے، ہر فرد، دوسروں کی ضروریات پورا کرنے میں خود اپنی ذات کا فائدہ دیکھتا ہے۔ اس لئے اس قسم کا معاشی نظام صرف اس ایمان کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے۔

کمیونزم کے پروگرام میں صرف حصہ (۲) ہوتا ہے۔ یعنی ملوکیت۔ نظامِ سرمایہ داری — مذہبی پیشوائیت کو مٹانا — انہیں مٹانے کے بعد، وہ سمجھ لیتی ہے کہ بس اب میدان مار لیا۔ اب ہمارا نظام خود بخود قائم ہو جائے گا — لیکن کوئی نظام، خود بخود قائم نہیں ہوا کرتا — نظام کے قیام کے لئے، مخالفتوں کا مٹانا، بے شک ضروری ہوتا ہے، لیکن اس کے بعد، ایک مثبت اساس کی بھی ضرورت ہوتی

ہے جس پر اس جدید نظام کی عمارت استوار کی جا سکے۔ قرآن کریم نے لَآ اِلٰہَ ـــ اِلَّا اللّٰہُ کے عظیم انقلابی فارمولا سے ایک مکمل پروگرام عطا کیا ہے۔ دیکھئے۔ وہ لَآ اِلٰہ کی منزل سر کر لینے کے بعد کہ جب تمام مخالفتوں کو راستے سے ہٹا دیا جائے، کسطرح اس حقیقت کو اجاگر کر کے سامنے لاتا ہے کہ اس سے تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ بس اب کرنے کا کام ختم ہوا۔ اب اس فتح و کامرانی کے ثمرات کو اطمینان سے بیٹھ کر کھاؤ۔ وہ کہتا ہے کہ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ وَ الۡفَتۡحُ ۔ وَ رَاَيۡتَ النَّاسَ يَدۡخُلُوۡنَ فِىۡ دِيۡنِ اللّٰهِ اَفۡوَاجًا ـــ جب فتح و کامرانی تمہارے قدم چومے۔ جب مخالفتیں سب سرنگوں ہو جائیں۔ جب لوگ فوج در فوج، تمہارے نظام میں داخل ہونا شروع ہو جائیں۔ تو اس وقت یہ نہ سمجھ لو کہ تمہارا پروگرام مکمل ہو گیا۔ تم نے کامیابی حاصل کر لی۔ بالکل نہیں۔ اس کے بعد تمہارے پروگرام کا نیا مرحلہ شروع ہوگا ـــ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّكَ وَ اسۡتَغۡفِرۡهُ ـــ اس کے بعد تمہیں اس نظام کے مستحق حمد و ستائش بنانے کے لئے اور بھی زیادہ سرگرم عمل ہونا پڑے گا۔ اور قدم قدم پر اپنی حفاظت کا سامان طلب کرتے رہنا ہوگا ـــ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا۔ (۱۱۰/۳) یہی ہے وہ طریق کار جس سے "خدا تمہاری طرف لوٹ کر آئے گا"۔ حصہ لَآ سے تم نے اس کے آنے کے لئے صرف راستہ صاف کیا ہے۔ اسے "لانے" کے لئے ابھی بہت کچھ اور کرنا ہوگا۔

دوسری جگہ نبی اکرمؐ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ "جس بوجھ نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی وہ بوجھ اٹھ گیا ہے۔ مشکلات کے بعد آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں" لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ تمہارا پروگرام بھی ختم ہو گیا ہے۔ بالکل نہیں۔ فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ـــ جب تو اس حصہ لَآ سے فارغ ہو گیا ہے، تو پروگرام کے دوسرے حصے کی تکمیل کے لئے جم کر کھڑا ہو جا۔ اور وہ پروگرام یہ ہے کہ اِلٰى رَبِّكَ فَارۡغَبۡ۔ (۹۴/۸) اپنی تمام توجہات، خدا کے نظامِ ربوبیت کے متشکل اور مستحکم کرنے پر مرکوز کر دے۔ یہ ہے اِلَّا اللّٰہ کا مرحلہ، یعنی مخالفتوں کے ہجوم سے فارغ ہو جانے کے بعد "خدا کی طرف متوجہ ہو جانے" کا پروگرام ـــ!

یہ ہے وہ پیغام، جس کے متعلق ہم نے کہا تھا کہ اگر اسے چین کے ارباب حل و عقد اور کمیونزم کے اصحابِ فکر و نظر تک پہنچا دیا جائے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اس پر غور کر کے، اپنے نظام کو انسانیت کی ان بلند اقدار پر متشکل کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں جس سے نوعِ انسان اس عذاب سے محفوظ رہ سکے جو ان کے موجودہ نظام کی ناکامی کے بعد، اس پر مسلط ہونے والا ہے، اس لئے کہ اس کے بعد نظام سرمایہ داری پورے جذبۂ انتقام کے ساتھ ابھرے گا اور جن جن راستوں سے اس نے دیکھا تھا کہ اس کی مخالف

قوتوں نے سر نکالا تھا، انہیں اس طرح بند کرے گا کہ اُدھر سے دوبارہ داخل ہونے کا کسی کو یارا نہ ہے۔

کہا جائے گا کہ جو اساس، قرآن کریم تجویز کرتا ہے اس کے لئے ماورائے عقلِ انسانی سرچشمۂ علم (وحی) پر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے۔ اور کمیونزم کے حامی کسی ایسے ذریعۂ علم کے وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں اس لئے وہ کس طرح وحی کی عطا کردہ اقدار کے تصور کو قابلِ اعتنا قرار دیں گے۔؟ یہ اعتراض بظاہر بڑا وزنی نظر آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کمیونزم کے حامی ہی نہیں، بلکہ مادی نظریۂ حیات کے ماننے والے، سب کے سب، خارج از عقلِ انسانی سرچشمۂ قوانین پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ قوانینِ فطرت کو مانتے ہیں اور ان قوانین کی کیفیت یہ ہے کہ یہ نہ تو عقلِ انسانی کے پیدا کردہ ہیں اور نہ ہی عقلِ انسانی ان کی کوئی توجیہہ پیش کر سکتی ہے۔ مثلاً یہ قانون کہ پانی اتنے درجۂ حرارت پر پہنچ کر کھولنے لگ جاتا ہے، عقلِ انسانی کا پیدا کردہ نہیں۔ اور نہ ہی انسانی عقل یہ بتا سکتی ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود، مادی نظریۂ حیات کے قائلین ان قوانین کی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ نظریہ قائم ہی اس بنیاد پر ہے کہ فطرت کے قوانین اٹل ہیں اور عقلِ انسانی کے پیدا کردہ نہیں۔!

اور کمیونزم کے حامی تو صرف فطرت کے طبیعی قوانین ہی کو خارجی (OBJECTIVE) نہیں جانتے، وہ اپنے معاشی نظام کے اصولوں کو بھی خارجی تسلیم کرتے ہیں۔ مارکس کا نظریۂ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) عقلِ انسانی کا پیدا کردہ نہیں۔ اس کا وجود خارجی ہے، اسی بنا پر ماؤ زے تنگ نے کہا ہے کہ

> طبقاتی جنگ ایک خارجی حقیقت ہے جس کا مدار لوگوں کے چاہنے یا نہ چاہنے پر نہیں۔ (پیکنگ ریویو۔ مورخہ ۶۶-۸-۱۰۔ ص ۷)

اور اس پر اس اخبار کا مدیر، اپنے مقالہ افتتاحیہ میں تبصرہ کرتا ہوا لکھتا ہے کہ

> کہ یہ امر بالکل معمول کے مطابق اور خارجی قوانین (OBJECTIVE-LAWS) کے موافق ہے کہ ایسا ہو)

اب ظاہر ہے کہ جو لوگ (OBJECTIVE LAWS) کے قائل ہوں انہیں یہ سمجھانا ناممکن نہیں ہو سکتا کہ بلند اقدارِ انسانیت، خارج سے ملتی ہیں (اسی کو وحی کہا جاتا ہے) ان لوگوں نے وحی کا انکار اس لئے نہیں کیا تھا کہ ان کے نزدیک ماورائے عقلِ انسانی کسی سرچشمۂ قوانین کا ماننا عقلاً ناممکن ہے۔ انہوں نے اس سے اس لئے انکار کیا تھا کہ ان کے سامنے جو کچھ وحی کہہ کر پیش کیا

جاتا تھا (یعنے عیسائیت کے عقائد) انہیں ان کی عقل صحیح تسلیم نہیں کرتی تھی۔ اس لئے انہوں نے کہہ دیا کہ اگر وحی کی تعلیم یہی ہے تو یہ وحی تمہیں مبارک۔ ہم اسے تسلیم کرنے سے باز آئے۔ اگر ان کے سامنے وہ وحی پیش کی جائے جس نے معاشی نظام تو اسی قسم کا پیش کیا ہے جس قسم کا نظام کمیونزم کا منتہائے نگاہ ہے اور اس کے لئے بنیاد ایسی مہیا کی ہے جس کا کمیونزم میں فقدان ہے۔ اور جس کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک میری بات عقل و فکر کی رُو سے سمجھی نہ جائے، اسے مت قبول کرو، ہو نہیں سکتا کہ وہ اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھیں۔

کہا یہ جائے گا۔ (اور یہ اعتراض عام طور پر کیا جاتا ہے) کہ اگر قرآنِ کریم نے اس قسم کا معاشی نظام دیا تھا، اور اس کے لئے ایسی اساسِ محکم بھی مہیا کر دی تھی تو وہ نظام (تھوڑے سے عرصہ کے بعد) آگے کیوں نہ چلا؟ یہ اعتراض بڑا سطح بینی پر مبنی ہے۔ ایک ڈاکٹر کسی مریض کے لئے ایک نسخہ تجویز کرتا ہے، وہ اُسے چند دنوں تک استعمال کرتا ہے اسے اس سے فائدہ ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ اس کا استعمال چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح اس کا مرض دور نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے ـــ تو اس کے بعد کیا آپ یہ کہیں گے کہ اگر وہ نسخہ واقعی شفا بخش تھا تو اس سے اس مریض کا مرض دور کیوں نہ ہوا؟

اگر وہ اس نسخہ کو متواتر استعمال کرتا رہتا اور اس کے باوجود مرض دور نہ ہوتا، تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس نسخہ میں شفا بخشی کی صلاحیت نہیں تھی۔ لیکن اسے ترک کر دینے کے بعد تو اس پر یہ اعتراض وارد نہیں کیا جا سکتا۔ وہ نسخہ آج بھی موجود ہے اور اس کا دعوےٰ ہے کہ اس میں آج بھی اس کی صلاحیت ہے کہ وہ اس مرض کو دور کر دے۔ اس کے دعوے کے کذب و صداقت کو پرکھنے کا طریق یہ ہے کہ اسے استعمال کر کے دیکھا جائے۔

ادھر ہم چین کے اربابِ بست و کشاد تک یہ پیغام اس لئے پہنچانا چاہتے ہیں کہ انہوں نے اس منزل کا آدھا سفر طے کر لیا ہوا ہے یعنی وہ اس کے حصۂ لا پر عمل پیرا ہو چکے ہیں۔ اس لئے ان کے لئے منزلِ مقصود تک پہنچنا دوسروں کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ ان تک اگر یہ آواز پہنچا دی جائے، تو چہ عجب کہ اقبال نے جو کہا تھا کہ ع

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانوں سے

وہ حقیقت دنیا کے سامنے ایک بار پھر آ جائے ـــــ

وَكَانَ ذَالِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا !

چینی عوام کے سامنے اس وقت جذبۂ محرکہ صرف ماؤ سے تنگ کی شخصیت ہے۔ وہ اسکی پرستش کرتے ہیں۔ اس کی خاطر سب کچھ لٹا دینے کے لئے تیار ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی صبر آزما قربانی کے لئے محض اس لئے آمادہ رہتے ہیں کہ اس سے ماؤ خوش ہوگا۔ ان کی تمام توجہات کا نقطۂ ماسکہ، ان کی سعی و عمل کا مرکز، ان کی بے پناہ محنت و مشقت کا محور، ماؤ کی ذات ہے۔ لیکن ماؤ تو بہرحال ایک فانی انسان ہے۔ اس نے زود یا بدیر مر جانا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد، چین کے پاس جذبۂ محرکہ کیا ہوگا؟ جو لوگ چین سے ہو کر آتے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ چین کے ارباب حل و عقد کو خود اس امر کا احساس ہے اور وہ اس مشکل ترین سوال کا حل دریافت کرنے کے لئے بے حد متفکر اور متوش ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس مشکل کا حل انہیں مل نہیں سکتا۔ شخصیتیں بہرحال آنے جانے والی ہوتی ہیں۔ جو نظام شخصیات کے سہارے قائم ہوگا وہ ناپائیدار ہوگا۔ پائندگی تو نظریۂ حیات اور فلسفۂ زندگی ہی کے لئے ہو سکتی ہے بشرطیکہ اس میں زمانے کے تقاضوں کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہو۔ اور یہ نظریۂ حیات کمیونزم کے ہاں ہے نہیں، اس لئے چین کے ارباب فکر و نظر کی ہزار تمناؤں اور صد ہزار کاوشوں کے باوجود، انہیں اس مشکل کا حل مل نہیں سکتا۔ یہ سوال خود قرآن کریم کے بھی پیش نظر تھا جسکا حل اس نے یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ یاد رکھو:-

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ۔ (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز ایں نیست، اللہ کا ایک رسول ہے۔ اس سے پہلے بہت سے رسول آئے اور (اپنے فرائض سرانجام دیکر دنیا سے) چلے گئے تو کیا اگر یہ کل کو وفات پا جائے یا قتل کر دیا جائے تو تم (یہ سمجھ کر کہ یہ نظام اس کی ذات سے وابستہ تھا، اس لئے اس کی وفات سے ختم ہو گیا) پھر اپنے نظام کہن کی طرف پلٹ جاؤ گے؟

اور یہی تھی وہ حقیقت کبریٰ جس کا حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اس وقت اعلان کیا جب نبی اکرمؐ کی وفات سے بعض قلوب میں یہ خیال ابھرا کہ اب کیا ہوگا؟ اس خیال کو رفع کرنے کے لئے جناب صدیق اکبر رضؓ نے منبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اے جماعت مومنین! اس حقیقت کو سمجھ لو کہ تم میں سے جو شخص محمدؐ کی عبودیت اختیار کئے ہوئے تھا اس کا معبود واقعی وفات پا گیا ہے۔ لیکن جو خدا کی

عبودیت اختیار کئے ہوتے تھا اس کو جان لینا چاہیئے کہ اس کا معبود زندہ و پائندہ ہے۔ اس اعلانِ عظیم سے آپ نے، شخصیات اور نظریۂ زندگی کے فرق کو نمایاں کر کے بتا دیا اور اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ اسلام خدا کے عطا کردہ اس نظریۂ زندگی کا نام ہے جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنے گا۔ اس کی بقا شخصیتوں سے وابستہ نہیں۔ اس لئے کہ شخصیتیں آنی اور فانی ہوتی ہیں۔ خدا کا عطا کردہ نظریۂ حیات زندہ و پائندہ ہے۔ یہ نظریۂ حیات آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس پر جب بھی عمل کیا جائے گا، یہ اپنے نتائج سامنے لے آئے گا۔ برعکس اس کے، چین کا موجودہ نظام ماؤزے تنگ کی ذات سے وابستہ ہے۔ اس کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر نہیں جو ماؤ (یا اُن کے دیگر زعماء) کی وفات کے بعد بھی باقی رہے۔ برعکس اس کے، ان کا فلسفۂ حیات وہ ہے جس پر اس نظام کی عمارت قائم رہ نہیں سکتی۔

یہ ہے وہ حقیقت جس کے پیشِ نظر ہم نے کہا ہے کہ اگر آج کوئی شخص، چین کے اربابِ فکر و نظر کے سامنے قرآن کریم کا فلسفۂ حیات پیش کر کے، ان پر اس کی اہمیت واضح کر دے، تو وہ نوعِ انسان کا بہت بڑا محسن ہوگا۔

اقبالؒ نے نٹشے کے ضمن میں کہا تھا کہ ؎

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اِس زمانے میں
تو اقبالؔ اس کو سمجھاتا، مقامِ کبریا کیا ہے

آج "اس مجذوبِ فرنگی" سے کہیں زیادہ، اہلِ چین کو "مقامِ کبریا" سمجھانے کی ضرورت ہے۔

لہ ہم نے اس مقالہ میں اِس نکتہ سے بحث نہیں کی کہ ہیگل کے فلسفہ میں، جس پر مارکس کے تخیل کی عمارت استوار ہوتی ہے، ثبات (PERMANENCE) کا تصور ہی نہیں۔ اس کی بنیاد تغیّر (CHANGE) پر ہے۔ اس لئے اس کی رُو سے مستقل اقدار کا تصور ہی غلط ہے۔ اس کے برعکس، قرآن کا فلسفۂ حیات، مستقل اور غیر متبدل اقدار کا حامل ہے، جو نہ شخصیات سے وابستہ ہیں، نہ تاریخی وجوب کے بدل جانے سے، قابلِ تغیر۔ اس نکتہ کی وضاحت (عند الضرورت) کسی دوسرے وقت پیش کی جائے گی۔

اسلامک سوشلزم

سوال آج کل ملک میں اسلامی سوشلزم کا چرچا ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں مرکزی اسمبلی میں عبدالکریم سومار صاحب نے اس کی طرف اشارہ کیا تو اس سے بحث چل نکلی۔ پھر روزنامہ "مشرق" کی ۲۲ جولائی کی اشاعت میں ان کا اِس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ شائع ہوا جس میں انہوں نے اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کی اور کہا کہ ہمیں یہ اصطلاح استعمال نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اسلام سوشلزم کے سہاروں کا محتاج نہیں۔ انہوں نے علماء سے کہا ہے کہ وہ تحقیق کر کے بتائیں — کہ اسلامک سوشلزم کی اصطلاح مسلمانوں کے استعمال میں کب اور کس طرح آئی۔ کیا آپ اس اہم سوال پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

جواب یہ کام تو سومار صاحب نے "علماء" کے سپرد کیا ہے کہ وہ تحقیق کر کے بتائیں کہ مسلمانوں میں اس اصطلاح کا استعمال کب سے اور کیونکر شروع ہوا، اس لئے ہم عامی اس باب میں لب کشائی نہیں کر سکتے۔ لیکن جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے، ہمیں اتنا معلوم ہے کہ ۱۹۵۰ء میں جب پاکستان کے وزیراعظم، محترم لیاقت علیخان (مرحوم) امریکہ تشریف لے گئے تو انہوں نے وہاں یہ کہا کہ پاکستان کا نظام، اسلامک سوشلزم پر مبنی ہوگا۔ اور اسلامک سوشلزم وہ نظامِ حیات ہے، جس کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ انہوں نے یہ بیان تو دیا، لیکن نہ وہاں، اور نہ یہاں اپنی واپسی پر آکر ہی یہ بتایا کہ اسلامک سوشلزم سے ہماری مراد کیا ہے، اور اسلام کے اِس نظامِ حیات کے خط و خال کیا ہیں جس کی نظیر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ اہلِ امریکہ کو لامحالہ اس کی تشویش ہوئی ہوگی کہ متعین طور پر معلوم ہو سکے کہ پاکستان کا معاشی نظام کس قسم کا ہوگا اور اس "مداری کے تھیلے میں" بالآخر ہے کیا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد (وسط ۱۹۵۱ء میں) امریکن سیمینار کے کچھ نمائندے پاکستان آئے اور انہوں نے کراچی کی ایک

تقریب میں براہ راست دریافت کیا کہ۔

ہم اسلامک سوشلزم کے متعلق بہت کچھ سنتے چلے آرہے ہیں۔ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامک سوشلزم کیا ہے اور سوشلزم کے عام تصور میں اور اسلامک سوشلزم میں کیا فرق ہے۔ نیز یہ کہ کیا اسلامک سوشلزم میں انفرادی کاروبار (PRIVATE ENTERPRISE) کی اجازت ہوگی؟

اس سوال کا جواب، اس تقریب میں سب سے پہلے مخزم الطاف حسین صاحب، مدیر جریدہ "ڈان" (حال وزیر مملکت پاکستان) نے دیا جس میں انہوں نے کہا کہ۔

چونکہ پاکستان میں ابھی اسلامک سوشلزم کی جزئیات مرتب ہو رہی ہیں اس لئے اس موضوع پر سرِدست تفصیلی گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ اتنا کہا جاسکتا ہے کہ اسلامک سوشلزم اور عام سوشلزم میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں انفرادی کاروبار کی تو اجازت ہوگی لیکن اس کا منافع غیر محدود طور پر افراد کے پاس نہیں جاسکے گا۔ اس منافع میں جمہور کا بھی حصہ ہوگا۔ پاکستان اس امر کی کوشش کر رہا ہے کہ وہ سوشلزم اور انفرادی کاروبار میں امتزاج پیدا کر سکے۔

الطاف حسین صاحب کے بعد ایک دوسرے صاحب (مسٹر سرور حسن) اٹھے اور انہوں نے کہا ــــ کہ اسلامک سوشلزم میں انفرادی کاروبار کی اجازت ہوگی لیکن دولت کو چند افراد کے ہاتھ میں جمع نہیں ہونے دیا جائے گا۔

اس کے بعد ڈاکٹر نذیر احمد صاحب نے فرمایا کہ اسلامک سوشلزم اس نظامِ زندگی کا نام ہے جس میں ہر ایک کو یکساں مواقع میسّر ہوں گے۔ اس کے بعد انہوں نے کہا کہ اس ضمن میں پاکستان نے جو قدم اٹھائے ہیں ان میں وہ شش سالہ قومی منصوبہ شامل ہے جس کا مقصد عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا اور ملک کے اقتصادیات میں توازن پیدا کرنا ہے۔

ان جوابات کو سنکر وہ امریکی نمائندے (غالباً) مطمئن واپس چلے گئے کہ خیر ــــ اس میں خطرہ کی بات کوئی نہیں۔ یہ اصطلاح یا تو محض بطور فیشن اختیار کی گئی ہے اور یا ہمیں ڈرانے کے لئے۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ ان کے ــــ " طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی "

طلوع اسلام نے اُسی وقت اس کا تعاقب کیا اور ان بزرگوں سے کہا کہ خدا کے لئے اسلام کی حالت پر رحم کیجئے۔ اس کے ساتھ اس قسم کے کھیل نہ کھیلئے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ پہلے اپنے ہاں یہ متعین کیجئے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور پھر دنیا کو بتائیے کہ پاکستان میں یہ معاشی نظام رائج ہوگا۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ کیجیے طلوع اسلام۔ بابت ستمبر ۱۹۵۱ء)

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ لندن اور کراچی کے درمیان ایک نہایت دلچسپ مذاکرہ کی طرح ڈالی گئی۔ یعنی ٹیلیفون پر مذاکرہ ــــ اس مذاکرہ کی ابتداء، مغرب کے مشہور مؤرخ، پروفیسر ٹوئن بی کی طرف سے ہوئی۔ فریق مقابل تھے چوہدری محمد ظفراللہ خان صاحب (جو اُس زمانے میں پاکستان کے وزیر خارجہ تھے) پروفیسر مذکور نے مذاکرہ کے شروع میں کہا کہ

> اسلام، ان روایات کا حامل ہے جو اس پُرآشوب زمانے میں دنیا کی مشکلات کے حل کے سلسلہ میں بہت کچھ پیش کر سکتی ہیں۔

اس کے بعد اس نے کہا آج دنیا جن مشکلات سے گذر رہی ہے۔ ان میں اقتصادی مسئلہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اقتصادی مسئلہ کی اصل وبنیاد، کاشتکاری کا مسئلہ ہے (یعنی زمینداروں اور کاشتکاروں کا مسئلہ) پاکستان جو اسلامی مملکت ہونے کا مدعی ہے، اس مسئلہ کا کیا حل پیش کر سکتا ہے؟

سوال کی اہمیت کا آپ نے اندازہ کر لیا۔ اب چوہدری صاحب کا جواب سنیئے۔ انہوں نے فرمایا کہ۔

> ہم نے ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم بنائی ہے جس سے ہماری انڈسٹریز کو فائدہ پہنچے گا۔ اور انڈسٹری اور زراعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہم نے خود زراعت کی ترقی کے لئے بھی کچھ تجاویز سوچی ہیں۔ سندھ اور پنجاب میں ایسی قانونی اصلاحات نافذ کی ہیں جن سے مزارعین کو مزید رعایات حاصل ہو جائیں گی۔ مشرقی پاکستان میں دوامی بندوبست کی لعنت کو دور کر دیا ہے۔

(طلوع اسلام ستمبر ۱۹۵۱ء، صفحہ ۶۳)

آگئی آپ کے سامنے اسلامی سوشلزم کی ایک جھلک جس کے متعلق محترم لیاقت علی خان (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ اس کی نظیر دنیا میں کبھی نہیں مل سکتی؟

اس کے بعد بھی کبھی کبھی اس اصطلاح کی صدائے بازگشت مختلف اطراف سے سننے میں آتی رہی۔ اور ہم نے ہر موقعہ پر یہی کہا کہ سوال نئی اصطلاحات وضع کرنے کا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ آپ پہلے

متعین کریں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور پھر اس نظام کو دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ہمارے ارباب بست و کشاد میں سے کسی نے آج تک یہ نہیں کیا۔ ویسے، ان الفاظ کو (بغرضِ حصولِ ثواب) سب دہراتے رہتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے جس میں زندگی کے ہر گوشے ـــ سیاسی، معاشرتی، معاشی، اقتصادی، عمرانی، دینی، دنیاوی ـــ کے متعلق مکمل اور ابدی قوانین موجود ہیں۔ چنانچہ محترم سومار صاحب کے محولہ بالا مقالہ میں بھی کہا گیا ہے کہ

> سرمایہ داری سوشلزم سے بہتر ہے میں یہ ضرور کہتا ہوں اور اس رائے پر ہمیشہ ثابت قدم رہوں گا۔ لیکن بہترین نظام، اسلامی نظام ہے، جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ سوشلزم۔ اسلام ایسا واحد نظام اور واحد نظریہ ہے، واحد فلسفہ اور وہ واحد طرزِ زندگی ہے جو نوعِ انسانی کو اقتصادی، سماجی، سیاسی اور تمام شعبہ ہائے زندگی میں فلاح مہیا کر سکتا ہے۔ مجھے یہ کہنے دیجئے کہ سوشلزم کی طرف مت دیکھو۔ سرمایہ داری کی طرف مت دیکھو۔ ہاں اسلام کی طرف دیکھو[1] کیونکہ پاکستان کے مسائل اور ساری نوعِ انسانی کے مسائل کا حل اسلام میں ہے۔

سومار صاحب نے یہ تو کہا ہے لیکن اتنے لمبے چوڑے مقالہ میں یہ کہیں نہیں بتایا گیا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا جس میں تمام نوعِ انسان کے مسائل کا حل موجود ہے ـــ اسلام سرمایہ داری نہیں ـــ اسلام سوشلزم نہیں ـــ پھر اسلام ہے کیا؟ اس کا بھی کچھ پتہ نہیں! کیا کہنے ہیں اس اسلام کے؟ ہندوؤں کے فلسفہ ویدانت میں خدا کے متعلق صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ نیتی۔ نیتی۔ وہ یہ بھی نہیں۔ وہ، وہ بھی نہیں ـــ وہ ہے کیا، اس فلسفہ میں یہ نہیں بتایا جاتا۔ یہی حال ہمارے ہاں بیچارے اسلام کا ہو گیا ہے۔ کوئی شخص نیتی نیتی سے آگے نہیں بڑھتا۔ ان کے ہاں لاالٰہ کی منزل اتنی وسیع ہے کہ اس کے بعد اِلاّ اللہ کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ جن قوموں کے سامنے زندگی کا کوئی نصب العین نہ ہو وہ لا کی منزلوں میں سرگرداں رہتی ہیں۔ اِلاّ تک پہنچنا ان کے مقدر میں نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں بھی لا ہی لا ہے۔ اِلاّ کہیں نہیں۔ اور اسی وجہ سے روز اس قسم کے الجھاؤ پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

سوشلزم کی اصطلاح آج کل اس قدر عام ہو رہی ہے کہ ("مذہب" کی طرح) اس کا متعین مفہوم

---

[1] اسلام کیطرف دیکھو ـــ اور مسلسل دیکھتے رہو۔ حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ۔ (تا آنکہ تم قبر تک پہنچ جاؤ)

سامنے ہی نہیں آتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کے حامل، اپنے انسانیت سوز نظام کی وجہ سے بڑے جھینپے جھینپے سے رہتے ہیں اور کہیں کھل کر فخریہ اس کا اعلان نہیں کرتے کہ ہمارا نظام سرمایہ دارانہ ہے۔ وہ اسے کہیں (FREE ENTERPRISE) سے تعبیر کرتے ہیں کہیں (LAISEZ-FAIRE) سے۔ کہیں اس کا نام (SOCIAL WELFARE) رکھتے ہیں۔ کہیں (SOCIAL JUSTICE) وہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اس طرح الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا کر مبتلائے فریب رکھ سکیں گے۔ ہم نے سوشلزم کا لفظ جب بھی استعمال کیا ہے، ایک معین معانی میں استعمال کیا ہے اور انہی معانی میں ہم اس وقت بھی اس اصطلاح کو استعمال کریں گے۔ جیسا کہ ہم متعدد بار لکھ چکے ہیں (اور خود اشاعت زیر نظر میں بھی دوسرے مقام پر اس کا ذکر آیا ہے) مارکس۔ لینن نے جس معاشی نظام کا تصور پیش کیا تھا اس کی عبوری شکل کا نام سوشلزم ہے۔ اور انتہائی شکل کا نام کمیونزم۔ لیکن مارکس۔ لینن نے صرف ایک معاشی نظام ہی پیش نہیں کیا۔ انہوں نے وہ فلسفہ حیات بھی پیش کیا جس پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی تھی۔ یہ فلسفہ حیات، مادی جدلیت (MATERIALISTIC DIALECT) کہلاتا ہے۔ یہ خالص مادہ پرستی ہے جس میں خدا، وحی، مستقل اقدار حیات، آخرت کا انکار ہے۔

علامہ اقبالؒ، روس کی اس جدید انقلابی تحریک کا غائر نگاہ سے مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ کمیونزم (یا سوشلزم) کا معاشی نظام تو قریب قریب وہی ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ لیکن اس کا فلسفہ حیات، اسلام کی یکسر نقیض ہے۔ اور کسی مسلمان کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ نیز انہوں نے علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کو بھی محسوس کیا کہ اس قسم کا معاشی نظام صرف اس فلسفہ حیات کی بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ حیات اس بار گراں کا متحمل ہو نہیں سکتا۔ اس لئے مارکسی کمیونزم دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس نظام کو اگر قرآنی بنیادوں پر استوار کیا جائے تو پھر یہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۱ء میں سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام ایک خط میں جو اپنا مشہور فارمولا بتایا تھا۔ اس سے یہی مفہوم تھا۔ وہ فارمولا تھا۔

بالشوزم + خدا = اسلام

اس سے ان کا مقصد یہی تھا کہ بالشوزم کے معاشی نظام کو اسلام کے فلسفہ حیات کی بنیادوں پر استوار کیا جائے تو وہ اسلام کے معاشی نظام کے مماثل ہو جاتا ہے اور جب انہوں نے اپنی مشہور نظم (ابلیس کی مجلس شوریٰ) میں ابلیس کی زبان سے یہ کہلوایا تھا کہ

مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

تو اس سے بھی ان کی یہی مراد تھی کہ بالشوزم کے معاشی نظام کو اگر مارکسی فلسفہ کے تابع رکھا جائے تو نہ صرف یہ کہ وہ نظام چل نہیں سکتا بلکہ اس سے اس قسم کے انسان پیدا نہیں ہو سکتے۔

ہو جن کی نگہ زلزلۂ عالمِ افکار

یہ صلاحیت صرف اسلامی نظام میں ہے۔ اور اس لئے وہ ہر طاغوتی نظام کے لئے "فتنہ" ہے۔ علامہ اقبالؒ عمر بھر اپنے اس تصور کو عام کرتے رہے — وہ تائید کرتے رہے کمیونزم کے معاشی نظام کی (کیونکہ وہ قرآن کے معاشی نظام کے مماثل ہے) اور مخالفت کرتے رہے اس کے فلسفۂ حیات کی جو اسلام کے نظریۂ زندگی کی نقیض ہے۔

اب ہمارے ہاں ہو رہا ہے کہ اقبالؒ نے جہاں سرمایہ داری کی مخالفت کی ہے، کمیونسٹ، اس کے ان اقوال کو سوشلزم کی تائید میں پیش کر دیتے ہیں۔ اور جہاں اس نے سوشلزم کے فلسفۂ حیات کی مخالفت کی ہے، سرمایہ داری نظام کے حامی کہہ دیتے ہیں کہ دیکھئے! اقبالؒ کس طرح سوشلزم کا مخالف ہے! ع

ہر کسے از بہرِ خود شُد یارِ من

قائداعظمؒ نے بھی اسلامک سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے اسے علامہ اقبالؒ کے تتبع میں، انہی کے فارمولے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ یعنی سوشلزم کا معاشی نظام جسے اسلام کے فلسفۂ حیات کی بنیادوں پر استوار کیا جائے۔ اس لئے کہ وہ نظامِ سرمایہ داری کے سخت مخالف تھے۔ اور پاکستان انہوں نے حاصل ہی اس لئے کیا تھا کہ یہاں اسلامی فلسفۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کی جا سکے۔

جہاں تک اس اصطلاح (اسلامک سوشلزم) کا تعلق ہے، ہمارا خیال یہی ہے کہ ہمیں اس قسم کی اصطلاحات کو اپنے ہاں استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ ہر نظام کی اپنی اصطلاح ہوتی ہے اور وہ اصطلاح اسی نظام کے منطوق کے اظہار کے لئے وضع کی جاتی ہے۔ جب ایک کمیونسٹ "سوشلزم" کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد ہوتی ہے وہ معاشی نظام جو مارکس کے فلسفۂ حیات پر متفرع ہے۔ اس لئے "اسلامی سوشلزم" اجتماعِ ضدین ہے۔ قرآنِ کریم نے جب ہمیں ایک نظامِ زندگی دیا ہے تو اس نظام کے صحیح صحیح تصور کے اظہار کے لئے اصطلاحات بھی خود ہی تجویز کر دی ہیں۔ دین، ایمان، تقویٰ، اعمالِ صالح، صلوٰۃ، زکوٰۃ وغیرہ اس کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ ان کے مرادفات کسی زبان میں نہیں مل سکتے۔ اس لئے ان کی جگہ دوسری اصطلاحات استعمال کرنا تو ایک طرف، ان کا ترجمہ بھی کسی دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ دین

کی جگہ مذہب یا (RELIGION) کی اصطلاح استعمال کرنے سے کس طرح اسلام کا پورے کا پورا تصور ہی بدل گیا۔

قرآن کریم کے معاشی نظام کا منتہائے نگاہ ربّ العالمینی ہے۔ یعنی تمام افرادِ انسانیہ کی طبیعی ضروریات پورا کرنے اور ان کی ذات کی نشو ونما کا سامان بہم پہنچانے کی ذمہ داری۔ اس عظیم ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس نے معاشی نظام کی اصولی راہ نمائی دی ہے جس میں ذرائع پیداوار انفرادی ملکیت میں رہنے کے بجائے، ملّت کی اجتماعی تحویل میں آجاتے ہیں اور اس طرح محنت کش کی محنت کو کوئی غصب نہیں کرسکتا۔ چونکہ اس نظام کی بنیاد قرآن کی مستقل اقدار پر ہوتی ہے جو مختلف افراد کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کرنے کا جذبہ محرکہ بنتی ہیں۔ اس لئے اسے کسی غیر قرآنی اصطلاح سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اس کے لئے (ربّ العالمینی کی جہت سے) نظامِ ربوبیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اسی کو قرآنی معاشی نظام (QURANIC ECONOMIC SYSTEM) بھی کہہ سکتے ہیں۔

باقی رہا نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم کا تقابل، تو ہمارے نزدیک اس کی مثال خنزیر کے گوشت اور جھٹکا کئے ہوئے بکرے کے گوشت کی سی ہے۔ اسلامی نقطۂ نگاہ سے یہ دونوں حرام ہیں۔ لیکن بکرے کو اگر خدا کا نام لے کر ذبح کر لیا جائے تو وہ حلال ہو جائے گا۔ لیکن خنزیر پر ہزار بسم اللہ پڑھیئے، وہ حرام کا حرام ہی رہے گا۔ سوشلزم کے معاشی نظام کو اسلامی فلسفۂ حیات کے تابع لے آیئے، وہ حلال وطیب ہو جائے گا۔

اسے ایک مرتبہ پھر سن لیجئے کہ نہ سوشلزم کو مارکس کے پیش کردہ فلسفۂ حیات سے الگ کر کے اسے "سوشلزم" سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، نہ قرآن کے پیش کردہ معاشی نظام کو، قرآن کے فلسفۂ حیات سے الگ کر کے اسے اسلامی نظامِ معاشی کہہ کر پکارا جاسکتا ہے۔ قرآن کے تصور کی رو سے کسی نظامِ حیات کو اس کے فلسفۂ حیات سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اسی لئے اسلام اپنے کسی نظام میں کسی دوسرے نظام کے ساتھ سمجھوتہ (COMPROMISE) نہیں کرسکتا کیونکہ سمجھوتہ کرنے میں، اس نظام ہی سے سمجھوتہ نہیں کیا جائے گا، اس کے فلسفۂ حیات سے بھی سمجھوتہ کیا جائے گا اور یہ شرک ہے۔

اسلامی نظام کو سوشلزم کہنے سے ایک خطرہ یہ بھی ہے کہ سوشلزم کا مفہوم، مختلف محرکات کے تابع بدل سکتا ہے۔ لیکن اسلامی نظام اپنی اصولی ہیئت کے لحاظ سے غیر متبدل ہے۔ لہٰذا دین کے تصور کے اعتبار سے بھی، قرآن کی غیر متبدل اصطلاحات، تبدیل ہو جانے والی اصطلاحات کے مقابلہ میں

بہر نوع بہتر ہیں، بشرطیکہ ان کا مفہوم قرآن سے متعین کر کے، اسے واضح الفاظ میں سامنے لے آیا جائے۔

سوفار صاحب نے اپنے مقالہ میں یہ بھی کہا ہے کہ اس کی بابت "علماء" سے تحقیق کرائی جاتے کہ اس "بدعت" کی ابتداء کہاں سے ہوئی تھی؟ اگر علماء سے تحقیق کرانے سے مقصود یہ ہے کہ ان سے فتویٰ حاصل کیا جاتے، تو اس کے لئے نہ کسی تحقیق کی ضرورت ہے نہ استفسار کی حاجت۔ ان کے ہاں یہ فتوے ہر وقت موجود ہے۔ کہ سرمایہ داری عین اسلام ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ بھوکے کو روٹی ملنی چاہیئے، وہ ملحد اور مرتد ہے۔ اسے حوالہٗ دار و رسن کر دینا چاہیئے۔ اس لئے کہ جس اسلام کے یہ حضرات علمبردار ہیں، وہ اسلام ہمارے دور ملوکیت اور جاگیرداری کا پیدا کردہ ہے جس کی تائید کے لئے پہلے غلط روایات وضع کی گئیں اور پھر ان روایات کی بنیادوں پر سرمایہ داری کا قلعہ تعمیر کر لیا گیا جس میں بیٹھ کر یہ حضرات، ہر اُس سینے کو اپنے فتاوے کے تیروں سے چھلنی کرتے رہتے ہیں جس میں انہیں اُس قلب حساس کی دھڑکن محسوس ہو، جو قاضی ازل کے اس فتوے سے لرزاں ہو کہ ؎

تدبّر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے! (اقبال)

خطوط اکے نام ٹسلیم دوم

شکوک شبہات اعتراضات

• پیدا ہوتے ہیں ۔ کس کے دل میں؟ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں!
• انکا جواب آپکے پاس کیا ہوتا ہے؟ ۔۔۔ ماتھے کی شکن، گھرکی، لاحول
• کیا اس سے اُن کے وہ شکوک رفع ہو جاتے ہیں؟ ۔۔۔

اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ یہ شکوک رفع ہوتے ہیں دلائل و براہین سے، علم اور بصیرت سے، بشرطیکہ سمجھانے کا طریقہ بھی دلنشین اور جاذب توجہ ہو۔ اگر آپ فی الواقعہ کسی نوجوان کے دل سے شکوک اور شبہات کی پھانسیں نکالنا چاہتے ہیں ۔۔۔ تو ۔۔۔ اُسے

دیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس میں کیا انقلاب آتا ہے۔

جلد اول آٹھ روپے	جلد دوم چھ روپے	جلد سوم چھ روپے

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

رابطہ باہمی

بزمِ بریڈفورڈ (انگلستان)

یہ بزم محترم دین محمدؐ صاحب نمائندہ بزم (۱۶۰ - سالٹ سٹریٹ) کے زیرنگرانی، قرآنی فکر کی نشرواشاعت کے سلسلہ میں نمایاں خدمات سرانجام دے رہی ہے۔ ماہنامہ طلوع اسلام، ان کے ہاں سے مل سکتا ہے۔ پرویز صاحب کے درسِ قرآنِ کریم کا انتظام موجود ہے۔ بزم کے ہیڈکوارٹر کے علاوہ (PRESTON - LANCS) میں محترم عبدالرزاق اور محترم محمدؐ عارف خواجہ قرآنی فکر کے سرگرم کارکن ہیں۔ پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا وہاں بھی انتظام ہے۔ (MIDDLES BOROUGH) میں محترم خواجہ لال دین صاحب بھی اس باب میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ بزم بریڈفورڈ مختلف مقامات پر درس سنانے کا انتظام کرتی ہے اور پمفلٹس بھی تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان احباب کی ہمت میں برکت عطا فرمائے۔

پاکستان

کے مختلف شہروں میں بزم میں بڑی تندہی اور سرگرمی سے رسالہ طلوع اسلام کی عام اشاعت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں جسکا اثر بڑا وسیع اور عالمگیر ہو رہا ہے۔ قرآنی فکر کی وسعتِ اشاعت سے ملک کے دور دراز گوشوں سے، اس فکر سے دلچسپی اور وابستگی کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ جن حضرات کو تبلیغاً رسالہ بھیجا جاتا ہے، ان کا ردِعمل بڑا خوشگوار اور حوصلہ افزا ہے۔ مختلف مقامات پر پرویز صاحب کے درسِ قرآن کریم میں لوگوں کا شغف بڑھ رہا ہے۔

اللہ تعالےٰ، قرآنِ کریم کے ان خدام کو، جو اسقدر تنگ دامانی کی حالت میں ایسا وسیع و عریض پروگرام بایں حسن و خوبی سرانجام دے رہے ہیں، اپنی تائید و نصرت سے نوازے۔

لاہور بزم کے سرگرم کارکن، ادارہ کے انتظامی امور میں اس کا نمایاں طور پر ہاتھ بٹا رہے ہیں اور اپنے قیمتی وقت کا خاصہ حصہ اس کام میں صرف کرتے ہیں۔ ادارہ ان کا بہ صمیم قلب شکر گذار ہے۔

ناظم — ادارہ طلوعِ اسلام - لاہور

پرویز صاحب کا درسِ قرآنِ کریم

لاہور ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ ہر اتوار کی صبح ۸ بجے ۔

کراچی ۔ سندھ اسمبلی ہال ۔ بندر روڈ ۔ ہر اتوار کی صبح ۹ بجے

لائلپور ۔ پنجاب ڈیریز ۔ ۵۔ دی ۔ پیپلز کالونی ۔
ہر جمعہ کی شب ۔ بعد نماز مغرب ۔

لیہ ۔ متصل ہوٹل نزد ریلوے اسٹیشن ۔ ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ ۔

ملتان ۔ میسرز شاہ محمد اینڈ سنز ۔ بیرون پاک دروازہ
ہر جمعہ ۔ بعد نماز مغرب

سرگودھا ۔ ۲/۷۴ سٹلائٹ ٹاؤن ۔ ہر اتوار ۵ بجے شام

راولپنڈی ۔ D الکوثر بلڈنگ ۔ متصل زنانہ کالج ۔
مری روڈ ۔ ہر جمعہ ۔ شام ۵ بجے ۔

سید حسن ۔ سید محمد حسین شاہ صاحب ، نمائندہ بزم سے وقت اور مقام دریافت کر لیا جائے ۔

انگلستان میں یہ درس بزمِ طلوعِ اسلام بریڈ فورڈ کے زیر اہتمام نشر ہوتا ہے ۔

طلوعِ اسلام کی کتابیں

یہاں سے بھی مل سکتی ہیں

لاہور

۱۔ انٹرنیشنل بک سروس .. .. ۵ ۔ دی مال
۲۔ گوشۂ ادب .. .. چوک انارکلی
۳۔ کلاسیک بک سیلرز .. .. .. ۴۲ دی مال
۴۔ مرکزِ ادب .. .. چوک انارکلی
۵۔ مکتبۂ پاکستان .. .. .. چوک انارکلی
۶۔ آئیڈیل بک ہاؤس .. .. .. ۱۹۴ انارکلی
۷۔ اورنگا بک سٹال .. .. .. اورنگا سینما گلبرگ
۸۔ بک سنٹر .. .. .. چوک رنگیل دی مال
۹۔ کوابیمرائنگ شاپ .. .. .. دی مال
۱۰۔ لاہور بک ڈپو .. .. ۶۵ دی مال
۱۱۔ نیشنل بک سٹال ...... چوک انارکلی ۔
۱۲۔ مقبول اکیڈمی .. .. .. سرکلر روڈ ۔
۱۳۔ بک پیلس .. .. .. گلبرگ مارکیٹ
۱۴۔ ادبستان .. .. .. چوک لکشمی ۔

لائلپور

۱۔ شریف سنز بک سیلرز .. .. کارخانہ بازار

ملتان

۱۔ دانشکدہ حسین آگاہی ۔

کراچی

۱۔ محمد اسلام صاحب ۔ ۱۰۰۱/۴ ۔ لوٹس روڈ ۔ نیو ٹاؤن
۲۔ اتوار کی صبح ۔ اسمبلی ہال ۔ بندر روڈ ۔ نزد سعید منزل

اِلزامات

اور اُن کی حقیقت

بدقسمتی سے پاکستان میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا ہے جس نے اپنی زندگی کا مشن یہ قرار دے رکھا ہے کہ طلوعِ اسلام کے خلاف بے بنیاد الزامات تراشے جائیں اور پھر انہیں ملک میں اس شدّ و مد سے پھیلایا جائے کہ لوگ اس جھوٹ کو سچ سمجھکر، طلوعِ اسلام کی بات تک سننا گوارا نہ کریں۔ چونکہ اس جھوٹے پروپیگنڈہ میں اس طبقہ کے سامنے ایک خاص مقصد ہے، اور وہ ایسا دانستہ کرتے ہیں، اس لئے ان لوگوں سے کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔ البتہ جو سادہ لوح اور نیک نیت انسان ان کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہوکر دل میں غلط خیال قائم کر لیتے ہیں، ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ مختصر الفاظ میں اصل حقیقت ان کے سامنے پیش کر دیجائے تاکہ وہ اس بدظنی سے بچ جائیں جسے قرآن مجید نے یہ کہکر گناہ قرار دیا ہے کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۔ (۴۹/۱۲)

اے ایمان والو! کسی کیخلاف بدظنی سے بہت زیادہ بچو، اس لئے کہ بعض بدظنی (انسان کو) گناہ (تک پہنچا دیتی) ہے۔

پہلا الزام: طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے۔

یہ الزام قطعاً غلط ہے۔ ہم جو کہتے ہیں صرف اس قدر ہے کہ نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، انسانی شرف اور کردار کی انتہائی بلندی پر ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہماری کتبِ روایات میں ایسی باتیں بھی آگئی ہیں جن

سے حضورؐ کی سیرت پر طعن پڑتا ہے۔ غیر مسلم انہی روایات کی بنا پر آئے دن حضورؐ کی ذاتِ اقدس پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس قسم کی روایات وضعی ہیں۔ ان کے متعلق ہمیں صاف الفاظ میں کہہ دینا چاہیئے کہ وہ رسول اللہؐ کے اقوال و افعال نہیں ہیں۔ یہی ہیں وہ روایات جن کے صحیح ہونے سے ہم انکار کرتے ہیں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا (بخاری)۔ ہم اسے صحیح حدیث نہیں مانتے، اور ہمارا خیال ہے کہ آپ بھی صحیح نہیں مانتے ہوں گے۔ اس قسم کی حدیثوں کے متعلق ہم کہتے یہ ہیں کہ یہ رسول اللہؐ کی ہو نہیں سکتیں۔ یہ وضعی ہیں اور حضورؐ کی طرف یونہی منسوب کر دی گئی ہیں۔ یعنی ہم رسول اللہؐ کی حدیث کا انکار نہیں کرتے بلکہ کہتے یہ ہیں کہ اس قسم کی احادیث کی حضورؐ کی طرف نسبت صحیح نہیں ہے۔

ایسی روایات کو چھوڑ کر، وہ احادیث جو نہ قرآن مجید کے خلاف ہوں اور نہ جن سے نبی اکرمؐ یا صحابہ کرامؓ کی شان کے خلاف کوئی طعن پڑتا ہو، ہم انہیں صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

دُوسرا الزام: طلوعِ اسلام مُنکرِ سُنّت ہے

اس سنگین ترین الزام کی تردید میں ہم اس سے زیادہ کچھ اور کہنا ضروری نہیں سمجھتے کہ پرویز صاحب کی مایہ ناز کتاب معراج انسانیت[1] کا ایک اقتباس درج کر دیں جو طلوع اسلام کے صفحات میں کئی بار پیش کیا جا چکا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

> خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لئے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت، اور کسی اور ہادی طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقامِ بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظمؐ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جس کو دیکھ کر ہر خبیر و بصیر پکار اٹھتا ہے کہ ؎

---

[1] بڑے سائز کی تقریباً آٹھ سو صفحات کی اس کتاب میں نبی اکرمؐ کی سیرت طیبہ کو قرآن کریم اور صحیح احادیث کی روشنی میں بڑے ذوق و شوق سے پیش کیا گیا ہے۔

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق دل بند و راہِ مصطفےٰ رو

(معراج انسانیت صفحہ ۱۷۵)

جس کا یہ ایمان ہو کیا اُسے منکرِ سُنّت کہا جا سکتا ہے ؟

تیسرا الزام: طلوعِ اسلام رسالت پر ایمان ضروری نہیں سمجھتا۔

اس الزام کی تردید میں بھی ہم پرویز صاحب کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ وہ "سلیم کے نام خطوط" (جلد اول صفحہ ۱۹۲) میں لکھتے ہیں :-

"ذرا سوچو کہ جب ایک مسلمان کہتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو اس کے پاس اس دعوے کی دلیل کیا ہے کہ قرآن واقعی خدا کا کلام ہے (معاذ اللہ! رسول اللہ کا خود ساختہ نہیں۔) تاریخ شاہد ہے (اور اس کا ہمیں بھی اقرار ہے)، کہ دنیا کو قرآن محمد ابن عبداللہ نے دیا تھا۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہوا؟ اس کا صرف ایک ہی ثبوت ہے کہ خود محمد ابن عبداللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ کلام میرا نہیں، خدا کا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص محمد رسول اللہ (صلے اللہ علیہ وسلم) کی صداقت پر ایمان نہ لائے، قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں لا سکتا۔

چوتھا الزام: طلوعِ اسلام سُنّتِ رسول اللہ کو حجت نہیں مانتا۔

جیسا کہ "الزام ۲" کے تحت آپ دیکھیں گے، طلوعِ اسلام کا عقیدہ اور مسلک یہ ہے کہ مختلف ارکانِ اسلام (نماز روزہ وغیرہ) کو اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریقے سے ادا کرتے چلے آ رہے ہیں، کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا ردوبدل کر سکے، یا کوئی نیا طریقہ وضع کرے۔
اب سوچئے کہ جو شخص (مثلاً) نماز کے مروجہ طریقہ میں نہ خود رد و بدل کرتا ہے نہ کسی اور شخص کو اس کا حق دیتا ہے، وہ سنتِ رسول اللہ کو حجت نہیں مانتا تو اور کیا کرتا ہے۔ حجت کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ اسے مستند سمجھا جائے اور کسی شخص کو اس میں ردو بدل کرنے کا مجاز نہ سمجھا جائے۔

پانچواں الزام: طلوعِ اسلام حکومت کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے

اس الزام کی تردید میں ہم پرویز صاحب کے اس خط کا متعلقہ اقتباس درج کر دینا کافی سمجھتے ہیں جو انہوں نے (کفر کے فتوے کے جواب میں) مفتی محمد شفیع صاحب کے نام لکھا تھا۔

اطاعتِ رسول اور اطاعتِ خدا کے متعلق جو کچھ میں کہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صورت یہ نہیں تھی کہ ہر شخص اپنے اپنے مفہوم کے مطابق خدا اور رسولؐ کی اطاعت کر لیتا تھا۔ اس کی صحیح شکل یہ تھی کہ حضورؐ کے بعد جو خلافت علےٰ منہاجِ نبوت قائم ہوئی تھی اس سے پوچھا جاتا تھا کہ فلاں معاملہ میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کس طرح کی جائے گی جو فیصلہ وہاں سے ملتا اسے خدا اور رسول کی اطاعت سمجھا جاتا۔ اسی سے وحدتِ امت قائم تھی۔ جب خلافت باقی نہ رہی تو خدا اور رسولؐ کی اطاعت انفرادی طور پر ہونے لگی۔ اس سے امت میں افتراق پیدا ہوا۔ اُمت میں دوبارہ وحدت پیدا کرنے کی صورت یہ ہے کہ پھر سے خلافت علےٰ منہاجِ نبوت قائم کی جائے اور اس کے فیصلوں کے مطابق خدا اور رسولؐ کی اطاعت کی جائے۔ اسی خلافت کو بغرضِ اختصار، مرکزِ ملت یا اسلامی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور میں اس کی بار بار وضاحت کر چکا ہوں۔ میں نہ ہر نظامِ حکومت کو اسلامی نظام کہتا ہوں اور نہ اس کے فیصلوں کی اطاعت کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت۔ میرے نزدیک خلافت علےٰ منہاجِ نبوت کے علاوہ کوئی نظام اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ اور نہ اُسے مرکزِ ملت قرار دیا جا سکتا ہے۔

(طلوعِ اسلام۔ مئی جون ۶۲ء صفحہ ۱۵۲-۱۵۳)

جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہم اپنے آپ کو نہ اس وقت ان طریقوں میں کسی قسم کے ردّ و بدل کرنے کا مجاز سمجھتے ہیں جن پر اُمت کاربند ہے۔ نہ خلافت علےٰ منہاجِ نبوت قائم ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو اس کا مجاز سمجھیں گے۔ ہم اُس وقت اس طریقے کے مطابق چلیں گے جس پر وہ خلافت ہمیں چلائے گی۔ البتہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر دین کی حکمت اور امت کی بہتری کی خاطر وہ خلافت کسی سابقہ فیصلہ میں کچھ تبدیلی کرنا چاہے، تو وہ ایسا کرنے کی مجاز ہوگی (مثلاً) نبی اکرمؐ کے زمانہ میں تمام مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتی تھیں، لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس طریق کو بدل دیا اور مفتوحہ زمینوں کو حکومت کی تحویل میں لے لیا، تاکہ اس سے افرادِ مملکت کی ضروریات پوری کی جا سکیں۔ ہم

سمجھتے ہیں کہ جب پھر اُسی قسم کی خلافت قائم ہو جائے جیسی حضرت عمرؓ کے زمانے میں تھی تو وہ اس قسم کے فیصلے کرنے کی مجاز ہوگی۔

چھٹا الزام: تین نمازیں۔ نو دن کے روزے

کہا جاتا ہے کہ طلوع اسلام کہتا ہے کہ نمازیں صرف تین وقت کی ہیں اور روزے نو دن کے۔

یہ سراسر جھوٹ ہے۔ طلوع اسلام نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ اس کے برعکس ہم نے بار بار اعلان کیا ہے کہ امت کے مختلف فرقے جس جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے چلے آرہے ہیں، ہمیں ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا حق حاصل نہیں، نہ ہی کوئی نیا طریقہ ایجاد کرے گا۔ البتہ ہم یہ ضرور کہتے ہیں کہ

(۱) ان باتوں میں مختلف فرقوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے ان کی بنا پر آپس میں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے — اور

(۲) نماز، روزہ وغیرہ کو محض رسمی طور پر ادا نہیں کر لینا چاہیئے۔ اُس رُوح اور مقصد کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے جن کے لئے یہ احکام دیئے گئے تھے۔ رسمی نمازیں اور بے رُوح روزے، وہ انقلاب نہیں پیدا کر سکتے جو انقلاب محمد رسول اللہ والذین معہ نے دنیا میں پیدا کر کے دکھایا تھا۔

ساتواں الزام: اُردو میں نماز

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ طلوع اسلام نے اُردو میں نماز پڑھنے کا طریقہ ایجاد کیا ہے، یہ طلوع اسلام کے خلاف کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ کچھ سال اُدھر کا ذکر ہے کہ لاہور میں کسی صاحب نے عید کی نماز اُردو میں پڑھائی۔ جب اس واقعہ کی خبر طلوع اسلام کو پہنچی (جس کا دفتر اُس زمانہ میں کراچی میں تھا) تو اُس نے سب سے پہلے اس کی مخالفت کی اور لاہور میں بڑے بڑے پوسٹر اس کے خلاف لگوائے۔ اس کے بعد یہ آج تک اس تحریک کی مخالفت کرتا چلا آرہا ہے۔

اس ایک واقعہ سے اندازہ لگائیے کہ طلوع اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے والے کس دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتے ہیں

آٹھواں الزام: طلوعِ اسلام ایک نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے

طلوعِ اسلام پہلے دن سے اعلان کرتا چلا آرہا ہے کہ اسلام دُنیا میں امتِ واحدہ پیدا کرنے کے لئے آیا تھا اور نبی اکرمؐ نے ایسی اُمت پیدا کر کے دکھا دی تھی جس میں کوئی فرقہ نہیں تھا۔ قرآن کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جس بات کو طلوعِ اسلام خلافِ اسلام اور شرک قرار دیتا ہے کیا وہ خود اس کا مرتکب ہو سکتا ہے؟ طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ کسی مذہبی فرقہ سے، نہ ہی وہ کوئی اپنی سیاسی پارٹی بنانا چاہتا ہے نہ مذہبی فرقہ۔ وہ امت میں اتحاد کا علمبردار ہے اور پوری نوعِ انسانی کا ایک عالمگیر برادری بنانے کا داعی۔ یہی اسلام کی تعلیم ہے۔

نواں الزام: طلوعِ اسلام قرآن کو نئے معنی پہناتا ہے

اللہ تعالےٰ نے ہر مسلمان کو حکم دیا ہے کہ وہ قرآن کریم میں غور و فکر کرے وہ اس میں غور و تدبر نہ کرنے والوں کو بڑی سخت سرزنش کرتا ہے۔ وہ عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو حیوانات سے بھی بدتر قرار دیتا ہے۔

طلوعِ اسلام اللہ تعالیٰ کے اس حکم کے مطابق، قرآن کریم میں غور و تدبر کرتا ہے اور اس کے نتائج دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کی سند خود قرآن سے پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد بھی وہ کسی کو مجبور نہیں کرتا کہ وہ بالضرور اس کے پیش کردہ مفہوم کو صحیح سمجھے، نہ ہی وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے، غلطی سے مبرا اور حرفِ آخر ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس قسم کے انفرادی غور و فکر کا حق کسی سے چھینا نہیں جا سکتا۔ آپ اس سے اختلاف کر سکتے ہیں، لیکن اسے غور و فکر کرنے سے نہیں روک سکتے؟ اگر کسی کو غور و فکر کا حق دیا جانا مقصود نہ ہوتا، تو اللہ تعالےٰ غور و فکر کرنے کا حکم کیوں دیتا؟

دسواں الزام: اسلاف کی مخالفت

اس سلسلے میں عوام کو یہ کہہ کر بھڑکایا جاتا ہے کہ دیکھو یہ شخص (پرویز) یہ کہتا ہے کہ

(۱) قرآن کو آج تک میرے سوا کسی نے نہیں سمجھا۔
(۲) جو کچھ ہمارے پاس اسلاف سے آرہا ہے، اس کو دریا بُرد کر دینا چاہیئے۔
(۳) تمہارے ائمہ اور اسلاف سب (معاذ اللہ) جاہل تھے۔ وغیرہ وغیرہ

یہ کچھ نہ کبھی پرویز صاحب نے کہا ہے، نہ طلوع اسلام نے، وہ کھُلے الفاظ میں کہتا ہے کہ

"ہمارا یہ مطلب نہیں کہ سلف سے جو کچھ تمہارے پاس آیا ہے وہ (معاذ اللہ) سب کا سب گمراہ کُن ہے۔ ایسا کون کہہ سکتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ تمہیں ان سے ملا ہے، آنکھیں بند کر کے اسکی پیروی مت کرو بلکہ شمع قرآنی کی روشنی میں ہمیشہ آنکھیں کھُلی رکھو۔ وہ بھی ہماری طرح انسان تھے، غلطی کر سکتے تھے لیکن قرآن کی کسوٹی کبھی غلطی نہیں کر سکتی۔" (طلوع اسلام۔ بابت اکتوبر ۹۴ء)

اس کا کہنا صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس جو کچھ اسلاف سے چلا آرہا ہے ہمیں چاہیئے کہ اسے قرآن کریم کی روشنی میں پرکھ کر دیکھ لیں، جو کچھ اس کے مطابق ہو اُسے صحیح تسلیم کر لیں۔ جو اس کے خلاف ہو اسے چھوڑ دیں۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ہماری کتب روایات میں اور اسلاف کی کتابوں میں بعض باتیں ایسی آگئی ہیں جو قرآن کے خلاف جاتی ہیں۔ ان باتوں کے متعلق طلوع اسلام کا مسلک وہ ہے جسے پرویز صاحب نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> میرے نزدیک نہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی بات (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف فرما سکتے تھے اور نہ ہی میں ان بزرگوں کے متعلق ایسا گمان کر سکتا ہوں کہ انہوں نے قرآن کے خلاف کچھ پیش کیا ہو۔ لہٰذا یہ چیزیں رسول اللہ اور ائمۂ ملت کی طرف غلط منسوب کر دی گئی ہیں (اور یہی عجم کی سازش تھی) اگر اس پر بھی کسی کو اصرار ہے کہ نہیں! یہ باتیں رسول اللہ (اور ائمہ کرام) ہی کی ہیں تو میں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ یہ جرأت آپ کو مبارک ہو۔ میں تو اس کے تصور سے بھی کانپتا ہوں کہ کسی ایسی بات کو جو قرآن مجید کے خلاف ہو، (معاذ اللہ) رسول اللہ یا حضورؐ کے کسی سچے متبع کی طرف منسوب کیا جائے۔
>
> (اسباب زوالِ اُمت صفحہ ۱۷)

سوچیئے کہ کیا یہ شخص اسلاف کا زیادہ احترام کرتا ہے، یا وہ جو اس کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ باتیں جو قرآن کے خلاف ہیں ہمارے اسلاف نے ضرور کہی ہیں۔

گیارھواں الزام: دعوائے نبوّت

جب ان لوگوں سے کوئی اور بات بن نہیں پڑتی تو کہہ دیتے ہیں کہ تم دیکھ لینا۔ پرویز صاحب ایک دن نبوّت کا دعویٰ کر دیں گے۔

پرویز صاحب کا عقیدہ یہ ہے (جس کا وہ سینکڑوں مقامات پر شرح و بسط سے اعلان کر چکے ہیں) کہ

(۱) نبی وہ ہے جسے خدا کی طرف سے وحی ملے۔

(۲) وحی سے مطلب ہے خدا کی طرف سے براہ راست حقیقت کا علم حاصل ہونا۔

(۳) نبی اکرمؐ کے بعد خدا کی طرف سے وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

(۴) ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ اب کسی شخص کو خدا کی طرف سے براہ راست کوئی علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس نے انسانوں کی راہنمائی کے لئے جو کچھ دینا تھا، قرآن کریم میں دے دیا اور اُسے قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا۔

(۵) ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وحی کا دروازہ بند ہو گیا لیکن کشف اور الہام کا دروازہ کھلا ہے۔ کشف اور الہام کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ چیز ختم نبوت کے منافی ہے اور وہ سیڑھی ہے جس سے لوگ نبوت تک کا دعویٰ کرنے لگ جاتے ہیں اس لئے ان راستوں کا بند کرنا نہایت ضروری ہے۔

اب آپ سوچئے کہ جو شخص ختم نبوت کے بعد وحی تو ایک طرف کشف والہام کا بھی قائل نہ ہو وہ نبوت کا دعوے کس طرح کر سکتا ہے۔ پرویز صاحب کا "دعوے" صرف اس قدر ہے کہ وہ قرآن کے ایک ادنیٰ طالب علم ہیں اور بس۔

بارھواں الزام: کمیونسٹ

ان جھوٹا پراپیگنڈہ کرنے والوں کی دیدہ دلیری کی انتہا ہو جاتی ہے۔ جب یہ لوگوں میں مشہور کرتے ہیں کہ طلوع اسلام، ملک میں کمیونزم پھیلاتا ہے۔ یہ کچھ اُس طلوع اسلام کے خلاف کہا جاتا ہے جس نے، تشکیلِ پاکستان سے اس وقت تک کمیونزم کے خلاف مسلسل جہاد شروع کر رکھا ہے اس نے مختلف انداز میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اس وقت دنیا میں اسلام کے لئے سب سے بڑا چیلنج

کمیونزم ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ اسلئے ــــ
نہ کوئی مسلمان کبھی کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے۔

(طلوع اسلام۔ ستمبر ۱۹۶۲ء صفحہ ۳۳)

اس لئے وہ دورِ حاضر میں کمیونزم کو اسلام کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتا ہے۔

البتہ وہ یہ ضرور کہتا ہے کہ قرآن کریم جس قسم کا نظام قائم کرتا ہے اس میں کوئی شخص نہ بھوکا رہ سکتا ہے، نہ ننگا۔ اس میں ہر فردِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری کرنے کی ذمہ داری مملکت پر ہوتی ہے۔ مملکت اپنی اس اہم اور عظیم ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے، ضرورت سمجھے تو ملک کے ذرائع پیداوار کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے لیکن مملکت کوئی ایسا قدم نہیں اٹھا سکتی جس سے کسی فرد کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) سلب ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام میں افراد کو طبعی ضروریاتِ زندگی کی طرف سے اطمینان ہی اس لئے دلایا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی وحیٔ خداوندی کے تابع رکھ کر، اپنی ذات (انسانی صلاحیتوں) کی نشوونما کر سکیں اور اس طرح دنیا میں بھی سرفرازی و سربلندی کی زندگی بسر کریں اور حیاتِ اُخروی میں زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو سکیں۔ سوچئے کہ کمیونزم کو، جو نہ وحیٔ خداوندی کو مانتی ہے اور نہ حیاتِ اخروی کو، اس نظامِ حیات سے کیا واسطہ؟

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ الزامات، جو طلوعِ اسلام کے خلاف تراشے جاتے ہیں اور جن کا اس قدر ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کی روشنی میں دیکھئے کہ کیا ان الزامات میں کوئی صداقت ہے؟ یہ لوگ طلوعِ اسلام کے خلاف اس قدر جھوٹا پراپیگنڈا اس لئے کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام اس تھیاکریسی کی مخالفت کرتا ہے جسے یہ لوگ یہاں قائم کرنا چاہتے ہیں اور جس میں انسانیت کا گلا گھٹ کر رہ جاتا ہے۔

یہ حضرات طلوعِ اسلام کے خلاف جھوٹے پراپیگنڈے تک ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ ہر قسم کا حربہ استعمال کرتے ہیں۔ اس باب میں آپ مولانا مودودی صاحب کے ایک ممتاز اور پرانے معتقد حکیم عبدالرحیم اشرف کا ایک بیان سن لیجئے۔ جو ان کے اخبار "المنیر" بابت ۱۹ ستمبر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا تھا (اشرف صاحب اب مودودی صاحب سے الگ ہو چکے ہیں) انہوں نے لکھا تھا:۔

میں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے ۱۷ دسمبر ۱۹۵۷ء کو ملتان جیل

میں ملاقات کی۔ اس موقعہ پر منجملہ دیگر امور کے "منکرین سنّت" اور ان کے فتنے کا بھی ذکر آگیا۔ اس پر مولانا ممدوح نے اشاعتِ لٹریچر کی ایک اسکیم بتلائی اور اس کی تکمیل کے سلسلے میں فرمایا کہ آپ چودھری غلام محمدؒ صاحب سے کہیں (جو اس زمانہ میں جماعتِ اسلامی سندھ کے قیم تھے) کہ وہ دفتر طلوع اسلام سے رابطہ پیدا کریں۔ اور وہاں کسی شخص کی تالیفِ قلب کرکے طلوع اسلام کے پتے حاصل کریں۔

آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جو لوگ رشوت دے کر پتے حاصل کرنے تک سے بھی گریز نہ کریں وہ الزام تراشی اور کذب بافی میں کیا باک محسوس کریں گے؟

ایک درخواست

اس سلسلہ میں ہماری آپ سے صرف ایک درخواست ہے اور وہ یہ کہ اگر آپ سے کوئی شخص طلوع اسلام کے خلاف کوئی بات کہے۔ تو آپ اس سے اتنا کہیئے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اس کی تائید میں طلوع اسلام یا پرویز صاحب کی کوئی تحریر دکھا دیجئے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد وہ کس طرح اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا یہ پروپیگنڈہ کامیاب ہی اس لئے ہو رہا ہے کہ لوگ اُن سے اس کا مطالبہ نہیں کرتے کہ جو کچھ آپ کہتے ہیں اس کی تائید میں طلوع اسلام یا پرویز صاحب کی تحریر دکھا دیجئے۔

یا آپ کم از کم اتنا ہی کیجئے کہ جو کچھ آپ سے کہا جاتے اس کے متعلق طلوع اسلام یا پرویز صاحب سے خود دریافت کر لیجئے کہ اس میں کہاں تک صداقت ہے۔

درسِ قرآن

اس کے جواب میں بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ پرویز صاحب اپنے درسِ قرآن میں اس قسم کی قابلِ اعتراض باتیں کہتے ہیں۔ پرویز صاحب کا درس ہر اتوار کی صبح ان کے مکان (واقعہ ۲۵-بی گلبرگ۔ لاہور) میں ہوتا ہے۔ جس کا جی چاہے اسے آکر سُن لے اور اپنا اطمینان کر لے کہ اس میں کون سی بات قابلِ اعتراض ہوتی ہے۔

پھر اتنا ہی نہیں کہ وہاں درس دیا گیا اور بات ہوا میں اُڑ گئی۔ ان کا ہر درس ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کر لیا جاتا ہے اور یہ ٹیپ (ہر اتوار کی صبح، کراچی (سندھ اسمبلی ہال) میں سنایا جاتا ہے اس کے

بعد راولپنڈی، سرگودھا، لائل پور، ملتان وغیرہ دیگر مقامات (حتیٰ کہ انگلستان میں) اسے دہرایا جاتا ہے۔ آپ ان مقامات میں سے کسی جگہ اس درس کو سنیئے اور پھر خود فیصلہ کیجئے کہ آیا اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات ہوتی ہے ۔۔۔؟ محض سنی سنائی باتوں پر نہ جائیے کیونکہ خدا کا حکم ہے کہ

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ (۱۷/۳۶)

جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو اس کے پیچھے نہ لگ جایا کرو۔

انسانی مسائل کے حل میں

عقلِ انسانی آج تک کن کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں۔۔۔ تاریخ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپکو صفدر پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملیگی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطون اعظم سے لیکر آج تک گذشتہ اڑھائی ہزار سال میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مورخین اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات نے کیا سوچا؟

اسے پڑھیئے اور سوچیئے کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہو کر نوعِ انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا۔

ملنے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت بارہ روپے ۱۲

حقائق و عبر

تھا کام تو مشکل مگر آسان نکل آیا

پچھلے دنوں ملک میں ریلوں کے جو آٹھ دس حادثات علی التواتر ہوئے ہیں، ان سے ہر قلب حساس متأثر ہوا ہے۔ محکمہ ریلوے نے ان کے متعلق ضروری تحقیقات کرائی ہیں اور وہ گہرے غور و فکر میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ ایسی تدابیر اختیار کی جائیں جن سے ان حادثات کا اعادہ ناممکن نہیں تو کم از کم حد تک رہ جائے۔ وہ اس سوچ ہی میں تھے کہ کراچی کے ایک صاحب ــــ حاجی فضل احمد کشمیری والا نے، ایک کھلی چٹھی، چیئرمین ــ ریلوے بورڈ ــ مغربی پاکستان ریلوے کے نام اخبارات میں شائع کرائی ہے اس میں انہوں نے لکھا ہے۔

> اگلے دنوں ریلوے کے جو حادثات واقع ہوئے ہیں ان سے میرے دل کو بڑا صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان حادثات میں مرنے والوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!
>
> میری آپ سے مؤدبانہ التماس ہے کہ آپ اس امر کے احکام فی الفور نافذ فرما دیں کہ انجن ڈرائیور، انجن چلانے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ضرور پڑھا کریں۔
>
> دوسری التماس یہ ہے کہ قرآن شریف کا ایک نسخہ ہر انجن میں اور گارڈ کے ڈبے میں رکھوا دیا جائے۔ (بحوالہ ڈان ـ مؤرخہ ۲۷-۷-۶۶)

معلوم نہیں حاجی صاحب نے اس نسخہ شافیہ کو ریلوے تک ہی محدود کیوں رکھا ہے حکومت پاکستان سے کیوں نہیں کہا کہ وہ ملک میں قانون نافذ کر دے کہ ہر ہوائی جہاز، موٹر، رکشا، بس، ٹرک وغیرہ میں قرآن شریف کا نسخہ رکھنا لازمی ہے۔ اس کے بغیر لائسنس نہیں ملے گا۔ یہ قانون نافذ کر دے اور

پھر ٹریفک پولیس کو موقوف کر دے کہ جب حادثات کو اس طرح معدوم کر دیا گیا تو پھر اس انتظام کی ضرورت کیا رہے گی!

بلکہ اس سے بھی سستا نسخہ ایک اور ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں (اور شاید دوسری میں بھی) بعض پیر صاحبان اپنے مریدوں کو انگریزوں کی فوج میں بھرتی کراتے تھے اور مرید کو ایک تعویذ دیتے تھے کہ وہ اسے باندھے رکھے گا تو گولی اس کو کوئی اثر نہیں کرے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ ریلوں اور بسوں میں قرآنِ مجید کے نسخے رکھنے کے بجائے، ان پر قرآنی آیات کے تعویذ باندھ دیئے جائیں۔ اس سے اور بھی بچت ہو جائیگی۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے کہ اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ محکمہ کسٹم نے، لوگوں کی بد دیانتی سے تنگ آکر، یہ طریق رائج کیا ہے (یا ایسی تجویز کی ہے) کہ تاجروں سے کہا جاتے کہ وہ اپنے کاغذات مرتب کرتے وقت، قرآن کی قسم اٹھا کر کہیں کہ انہوں نے کہیں بد دیانتی سے کام نہیں لیا۔ اس سے ان کے کاغذات منظور کر لئے جائیں گے ـــــ انا اللہ!

یہ وہ قوم ہے جسے دنیا سے بت پرستی مٹانے کے لئے بھیجا گیا تھا؛ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ کس بات کا نتیجہ ہے؟ یہ نتیجہ ہے قرآن مجید کو "کتاب" نہ سمجھنے کا۔ دنیا میں کوئی شخص کسی کتاب کے ساتھ یہ نہیں کرتا کہ اس کی تعلیم کو نہ سمجھا جائے، بلکہ کبھی اس کے الفاظ کو بلا سمجھے دہرایا جاتے، اور کبھی اس سے جنتر منتر کا کام لیا جاتے؛ (اس سلسلہ میں آپ طلوع اسلام بابت اگست میں، "ناظرہ قرآن شریف" کے زیر عنوان ہماری گذارشات ملاحظہ فرمائیں۔)

اور ابھی تو اس مملکت کو اسلامی بنے خیر سے چند ہی سال گزرے ہیں ـــ
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا؟

رشتہ کی ضرورت

ایک پنجابی ڈاکٹر (ایم۔ بی۔ بی۔ ایس) سلیقہ شعار، بلند خیال، ناکتخدا، لڑکی کے لئے، تعلیم یافتہ، سلیم الطبع، قرآنی فکر کے شائق، برسرِ روزگار لڑکے کے رشتے کی ضرورت ہے۔ عمر ۲۵ - ۳۰ سال کے درمیان۔

خط و کتابت:- (ا) معرفت ادارہ طلوعِ اسلام۔ ۲۵ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

نقد و نظر

(۱) "تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء"

شائع کردہ :- البیان چوک انارکلی۔

طباعت معیاری۔ ضخامت ایک ہزار چالیس صفحات۔

قیمت :- اعلےٰ ایڈیشن : تیس (۳۰) روپے۔ سستا ایڈیشن : بیس (۲۰) روپے۔

چوہدری حبیب احمد پاکستان کے اُن قومی کارکنوں میں سے ہیں جو پورے خلوص اور ولولے سے تحریکِ پاکستان کی قومی جدوجہد میں شریک کار رہے اور قیامِ پاکستان کے بعد انہوں نے بڑی شدت سے اس تلخ حقیقت کو محسوس کیا کہ وہ تمام عناصر جو جبہ و دستار کے نقاب میں خدا اور رسولؐ کے نام پر تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے۔ اس مملکت کے قیام کے بعد اسلام کے اجارہ دار بن کر آگے بڑھ آئے اور اقامتِ دین کے نعروں میں ذہنی انتشار کے ہنگامے برپا کرنے لگے۔ چوہدری حبیب احمد نہ مورخ ہونے کے دعویدار ہیں اور نہ بلند پایہ ادیب ہونے کے۔ لیکن اُن کی غیرتِ ایمانی نے واردھا آشرم اور آنند بھون کے ان خیمہ برداروں کی اِس مہم کو پاکستان کی سالمیت اور نظریۂ پاکستان کے بقاء و تحفظ کے لئے ایک چیلنج سمجھا اور وہ خم ٹھونک کر میدان میں نکل آئے۔ اپنی بے سروسامانی کے باوجود انہوں نے قلم کا سہارا لیا اور اس قلم کی نوک سے ہر اُس نقاب کو سرکانا شروع کر دیا جو ان عناصر کی حقیقت کو عوام کی نگاہوں سے اوجھل کئے ہوئے تھا۔ انہوں نے "جماعتِ اسلامی کا تاریخی کردار" لکھ کر مولانا مودودی اور ان کی جماعت کی سیاسی مہرہ بازیوں اور پسِ منظر کے مختلف گوشے بے نقاب کر کے رکھ دیئے۔

"تحریکِ پاکستان اور نیشنلسٹ علماء" اُن کے قلم کا نیا شاہکار ہے جو ابھی ابھی منظرِ اشاعت پر آیا ہے۔ یہ ضخیم کتاب ہمارے "نیشنلسٹ علماء" کی اُن روباہ بازیوں کو منظرِ عام پر لے آئی ہے جو انہوں

نے اسلامیانِ برصغیر کے اجتماعی نصب العین (حصولِ پاکستان) کے خلاف کانگریس کے مہاتماؤں اور پنڈتوں کے حاشیہ بردار بن کر سرانجام دیں۔ یہ کتاب بڑی وضاحت کے ساتھ اس حقیقت کو نگاہوں کے سامنے لاتی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم، مولانا حسین احمد مدنی مرحوم، مفتی کفایت اللہ مرحوم اور ان جیسے دوسرے چوٹی کے "نیشنلسٹ علماء" اپنی اس مہم میں کیا کیا پھول کھلاتے رہے اور ان کے ہزاروں شاگردانِ رشید منبر و محراب پر اپنی اجارہ داری کا فائدہ اٹھا کر انہوں کی راہ کے کانٹے اور غیروں کے ہاتھ کی تلوار بنے رہے۔

پاکستان کا کاروانِ حیات جن پُرپیچ راہوں سے گذرتا چلا آرہا ہے، ان کا تقاضا یہ ہے کہ اس مملکت کے عوام کو اُن دشمنوں سے آگاہ کر دیا جائے جو مذہبی پیشوائیت کے نقاب میں کاروانِ ملت کو دھوکا دیتے چلے آرہے ہیں اور اب اس کوشش میں ہیں کہ یہ مملکت جو اُن کی بدترین مخالفتوں کے باوجود قوم کی اجتماعی جدوجہد کے صدقے میں منصۂ شہود پر آگئی، ان کی پیشوائیت کا شکار ہو کر رہ جائے۔ ان حالات میں چوہدری حبیب احمد کی یہ قلمی کاوشیں قابلِ قدر ہیں اور ان سے پاکستانی عوام یہ سمجھنے کے قابل ہو سکتے ہیں کہ اسلام کے پردے میں پہلے اُن سے کیا کیا کھیل کھیلے گئے اور اب کیا کچھ عیاری اور مکاری سے ترتیب پا رہا ہے۔ یہ ایک جال ہے جو سادہ لوح عوام کو پھانسنے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے اور جو شخص بھی اس کے تار بکھیر کر رکھ دے وہ موجودہ اور آئندہ نسلوں کے نزدیک قابلِ قدر قرار پائے گا۔ چوہدری صاحب کی یہ کتاب وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اگر وہ اس کی ترتیب میں مزید محنت اور جانفشانی سے کام لیتے تو اس کی افادیت میں کافی اضافہ ہو سکتا تھا۔ بہرحال، یہ کوشش قابلِ تحسین ہے اور ہماری نئی نسل کو بالخصوص اس کے مطالعہ سے استفادہ کرنا چاہیئے۔

(۲) موسیقی کی شرعی حیثیت

پچھلے دنوں سے پاکستان میں پھر یہ بحث باعثِ گرمیٔ محفل بن رہی ہے کہ اسلام میں موسیقی حرام ہے یا حلال ـــ جس قوم میں مذہبی پیشوائیت موجود ہو گی، وہ اس قسم کے بے کار مشغلوں سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتی ـــ اس سلسلہ میں، موسیقی کو جائز قرار دینے والوں کی طرف سے امام غزالیؒ کی ایک کتاب کے حوالے دیئے جاتے رہے۔ بعض احباب کے استفسار پر ہم نے انہیں بتایا تھا کہ امام غزالی کی کوئی مستقل تصنیف اس موضوع پر نہیں۔ ان کی مشہور کتاب "احیاء علوم الدین" میں ایک باب اس موضوع پر ہے۔ زیرِ نظر کتاب اسی باب کا ترجمہ ہے، جسے سید نصیر شاہ اور رفیع اللہ صاحب نے اردو پیکر میں منتقل کیا۔ اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا تھا۔ قیمت اس کی دو روپے ہے

ترجمہ بڑا سلیس اور شگفتہ ہے۔ علاوہ بریں مترجمین نے ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے جس میں ان احادیث کو پرکھا گیا ہے جنہیں موسیقی کی حرمت میں بطور سند پیش کیا جاتا ہے۔ خود امام غزالی نے بھی اس قسم کی احادیث سے کافی بحث کی ہے اور شرح وبسط سے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ موسیقی جیسی چیز اسلام میں حرام ہو نہیں سکتی۔ اس سلسلہ میں امام صاحب نے ایک بڑی بنیادی بات کہی ہے۔ لیجئے:-

> جس شخص کو موسم بہار کے رنگین پھول اور ساز کی دلنواز تانیں متاثر نہ کر سکیں، سمجھو کہ اس کے مزاج میں کوئی خرابی ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

> نغمات سے روحِ انسانی کیوں متاثر ہوتی ہے؟ یہ سوال علومِ مکاشفات کے دقائق میں سے ہے۔ سنگدل اور غبی آدمی موسیقی کے اصل لطف سے محروم ہیں۔

اور امت کی بدقسمتی کہ یہی لوگ، شریعت میں حرام و حلال کے ترازو لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ دلچسپ یہ کہ ایک طرف یہ حضرات کتب روایات و تفاسیر کی سند سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام موسیقی کے بہت بڑے ماہر تھے اور کئی مزامیر (ساز) ان کی ایجاد ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں۔ کہ موسیقی دینِ خداوندی کی رُو سے حرام ہے۔ گویا، ان کے فیصلے کے مطابق، خدا کا ایک جلیل القدر پیغمبر (معاذ اللہ) ایک فعل حرام کا نہ صرف مرتکب ہوتا رہا بلکہ اس فن کا امام بھی کہلایا۔ یا للعجب!

لیکن حرام و حلال کی بحث سے قطع نظر، ہم مولوی صاحبان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ انہیں راگ کے حرام قرار دینے کے سلسلے میں کسی کدوکاوش کی ضرورت نہیں۔ ریڈیو پاکستان سے جس قسم کا راگ بالعموم نشر ہوتا ہے، اہل ذوق کے نزدیک اس کے حرام ہونے میں کوئی کلام نہیں۔ چند دنوں کے بعد یہ اپنی موت آپ مر جائے گا اور یہ سب بحثیں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔! نہ رہے گا بانس، نہ بجے گی بانسری!

مُفت مجرّب دوا۔ برائے۔ دمہ۔ درد گردہ۔ پتھری

حاجی محمد دین شیخ آسش فیکٹری متصل گنیش کھوپڑہ ملز۔ لارنس روڈ۔ کراچی

(نوٹ:- جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے)

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں بلکہ اپنے انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے **مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔**

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دلکش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیبی ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے)، جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے)، جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دلکش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت۔ بارہ روپے

نظامِ ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برقِ طور — صاحب ضرب کلیم اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان، جو یوں کہیے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰ کی بصیرت افروز داستانِ حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام / ضحی الاسلام — مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکہ آرا تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام سے لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ (فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے))

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرۂ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی شہرۂ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں مرقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی۔ گلبرگ۔ لاہور

Regd. L. No. 7243

MONTHLY TOLU-E-ISLAM LAHORE

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسئے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز بڑا دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد۔ پہلی جلد آٹھ روپے، دوسری و تیسری جلد (دس روپے فی جلد)

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ مجلد (بارہ روپے)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں۔ یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد بارہ روپے۔ مکمل سیٹ ستاون روپے۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی۔ معاشی۔ سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اسکی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا صحیح مقام کیا ہے۔ (قسم اعلیٰ۔ آٹھ روپے۔ حبیبی ایڈیشن۔ چار روپے)

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور